افسانے

خلیج

نوشابہ خاتون

نوشابہ خاتون کے ان افسانوں میں شکیلہ اختر یا ذکیہ مشہدی کو تلاش کرنا لا حاصلی کا عمل ہوگا۔ ہاں اُن کی جھلکیاں ضرور دیکھتا ہوں۔ جس ماحول سے یہ مصنفہ آئی ہیں وہاں سے جست لگا کر وہ عصمت چغتائی نہیں بن سکتیں لیکن اُن کا رشتہ اپنی تہذیب، اپنی شناخت اور اپنے الفاظ سے اتنا مضبوط ہے کہ اپنے خواب وہ اسی زبان میں دیکھتی ہیں جو انہیں اپنے بزرگوں سے ملی ہے اور ان ہی لفظوں کے دائرے میں وہ اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کی کائنات تعمیر کرتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے ورنہ وہ کسی پرائے رسم الخط میں لکھ کر زیادہ مقبولیت اور شہرت بٹور سکتی تھیں۔ وہ اپنے اردگرد کی ناہمواریوں، بدعنوانیوں، خود غرضیوں، اور استحصال کو دیکھ کر پریشان ہوتی ہیں اور یہ افسانے اُنہی کی زد میں آئی ہوئی شخصیت کا اظہاریہ ہیں۔

ڈاکٹر ارمان نجمی

خلیج

(افسانے)

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔
کتاب میں شائع مشمولات یا کسی قابلِ اعتراض مواد کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہے۔

خلیج

(افسانے)

نوشابہ خاتون

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

KHALEEJ
(Short Stories)
by: NAUSHABA KHATOON
Cell: 9693347545
Year of Edition 2019
ISBN 978-93-89002-09-6
₹ 300/-

کتاب : خلیج (افسانے)
مصنفہ : نوشابہ خاتون
سال اشاعت : ۲۰۱۹ء تعداد اشاعت : ۵۰۰
قیمت : ۳۰۰ روپے
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
پیشکش : مکتبہ انعکاس، مظفرپور (بہار)
کمپوزنگ : ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کمپاؤنڈ
گذری، پٹنہ سیٹی-۸۰۰۰۰۸

:- ملنے کے پتے :-

- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴
- پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ-۴

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

فہرست

انتساب

محترمہ امی حسنِ آرا مرحومہ کی

نرم و گداز یادوں کے نام

جن کی شفقتوں اور محبتوں کو میں

کبھی فراموش نہیں کر سکتی

نوشابہ خاتون

نوشابہ خاتون کی یہ کہانیاں

نوشابہ خاتون کے افسانوی مجموعے ’’قیدِ ہوس‘‘ کا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔ میں انے اس مجموعہ کے کئی افسانے پڑھے ہیں اور اس جہت سے مطمئن اور متاثر ہوا ہوں کہ معاصر افسانہ نگاروں میں نوشابہ نے اپنے اختصاص کی جہتیں پیدا کرلی ہیں۔ وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ افسانے اور ناول کا بنیادی مقصد کہانی یا واقعہ نہیں ہوتا۔ قصہ کہانی تو تخلیقی آرٹ کے لئے ایک Medium ہے۔ فنکار کا اصلی مدّعا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعات کے توسط سے کرداروں کے داخل میں ہونے والے تغیرات کا سراغ لگائے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں فنکار نفسیات سے قریب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی جملہ یا کوئی وقوعہ انسان کو یکسر بدل دیتا ہے۔ فنکار واقعات میں سے ایسے اہم وقوعوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے جن سے فطری تبدیلی کا جواز سامنے آسکے۔ اسی انتخاب سے کہانی کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔

نوشابہ خاتون کرداروں کے اندرون تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یوں دیکھئے تو ان کے افسانے عام کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن وہ کہیں نہ کہیں سے کردار کی نفسیات کی ایسی گرہوں کو کھولنے کا ہنر جانتی ہیں جن سے شخصیت کا ایک انوکھا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ افسانہ ’’سراب‘‘ کا بنیادی کردار ایک عام سا انسان لگتا ہے۔ اس کی نوجوانی اور طالب علمی کا زمانہ اس طرح گزرتا ہے کہ وہ اپنے چچا کے یہاں رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے اگرچہ اس کے

خورو پوش اور تعلیم کی ایک معقول صورت تو نکل جاتی ہے، لیکن اس کے ضمیر کو اس وقت جھٹکا لگتا ہے جب گھر کے سودا سلف اور معمولی کاموں میں اسے مصروف رکھا جاتا ہے۔ ضمیر میں ہونے والے اس کچوکے کو وہ کسی طرح برداشت کرلیتا ہے۔ تعلیم کی تکمیل، ملازمت اور شادی کے بعد اس کے اندرون کو دوسرا جھٹکا اس وقت لگتا ہے جب اچانک اس کی بیوی کا انتقال ہوجاتا ہے۔ وہ کسی طرح اپنی اکلوتی بیٹی کی پرورش بھی کرلیتا ہے اور بیٹی کو ہر طرح کی آسودگی دینے میں منہمک ہوجاتا ہے۔ بظاہر یہ بات اس کے لئے اطمینان و مسرت کی ہے کہ بیٹی کی شادی ایک ایسے نوجوان سے ہوجاتی ہے جو نہایت متمول اور نمایاں ہے، لیکن بیٹی سماجی اور مالی اعتبار سے اتنی مصروف اور مطمئن ہوجاتی ہے کہ اس کے پاس باپ کو دینے کے لئے وقت نہیں رہتا۔ وہ آئے دن بڑی بڑی تقریبات میں مصروف رہتی ہے۔ اس کا باپ گھبرا کر بیٹی کے یہاں سے واپس ہوجاتا ہے اور اس لمحے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں تہی دست ہوگیا ہے۔ افسانہ نگار نے ایک عام واقعے کی طرح کہانی کے تانے بنے تیار کئے ہیں، لیکن اخیر میں کردار کی جذباتی کیفیت کہانی میں بھرپور تاثر پیدا کردیتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے افسانے ''آشیاں اپنے'' میں ایک عورت شوہر کے انتقال کے بعد بیٹے کے یہاں اس لئے پہنچ جاتی ہے تاکہ اس کی تنہائی دور ہوجائے۔ پوتے پوتی سے مل کر دو لمحے کے لئے اسے خوشی تو ضرور ہوتی ہے، لیکن وہ یہ دیکھ کر گھبرا جاتی ہے کہ بہو ہو یا بیٹے یا ان کے بچے سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں رہتا کہ وہ اس بزرگ مہمان کے لئے وقت نکال سکیں۔

نوشابہ خاتون کے یہاں نئے سماجی ڈھانچے سے بیزاری کا شدید احساس ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں عام طور پر سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ ان میں

انسانی قدروں کی پاسداری ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اخلاقی ،اورانسانی قدروں کے تحفظ کی دھن میں مجرم کو واقعی سزا کا مستحق قرار دے کر اپنے اصلاحی مشن کا ثبوت دیتی ہیں۔ بلکہ اکثرو بیشتر واقعات کی سطح پر ایسا موڑ پیدا کردیتی ہیں جہاں کوئی غلط کردار اپنے اعمال سے خود پچھتاوا محسوس کرتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ نوشابہ کے یہاں کرداروں کی خود احتسابی کے ذریعے تخلیقی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔

جہاں تک افسانے کی تعمیر و تشکیل کا معاملہ ہے تو یہاں بھی نوشابہ خاتون کے یہاں انفرادیت کے نمایاں خطوط روشن ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں وقوعوں کی زمانی مدت کو سمیٹنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کی کہانیاں واقعات کی سطح پر اس قدر تیز رفتار ہیں کہ چند جملوں میں وہ کئی ادوار کو سمیٹ لیتی ہیں۔ واقعات بڑی تیزی کے ساتھ ان کی کہانیوں میں گزرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ قاری کو جلد سے جلد مآل کار تک پہنچانے کی قدرت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر نوشابہ کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں، لیکن اس اختصار کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس زمانی وسعت اور وقت کی سرعت کی متحرک تصویریں منعکس ہوجاتی ہیں۔ Artmanship اور کہانی گڑھنے کے اس ہنر کی وجہ سے نوشابہ معاصرین میں اہمیت کی حامل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو افسانے کے قارئین نوشابہ خاتون کی ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے جدت کی نئی تازگی محسوس کریں گے اور اردو کی ہم عصر افسانہ نگاری میں ان کے امتیاز کا اعتراف کریں گے۔

(علیم اللہ حالی)

خلیج: ایک مختصر مطالعہ

——ڈاکٹر ارمان نجمی

اس مجموعہ کے افسانوں میں نسائی احساس کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو ایک اندرون خانہ کی سکونت پذیر خاتون کے روز مرہ کے تجربات پر مبنی ہے۔ میں کسی بھی تحریر کو مردانہ یا زنانہ خانے میں بانٹ کر نہیں دیکھتا اور نہ میں اس تقسیم کا قائل ہوں۔ لیکن ایک عورت کی زندگی مرد کے ساتھ گذرتے ہوئے بھی مختلف ہوتی ہے۔ وہ گھر کی چہار دیواری میں رہ کر بھی باہری صداؤں سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اس کے اجتماعی لاشعور میں بہت سی ایسی آوازیں گونجتی رہتی ہیں جن کی بازگشت اس کے شعور کو متحرک کرتی رہتی ہیں۔

نوشابہ خاتون کے ان افسانوں میں شکیلہ اختر یا ذکیہ مشہدی کو تلاش کرنا لاحاصلی کا عمل ہوگا۔ ہاں اُن کی جھلکیاں ضرور دیکھتا ہوں۔ جس ماحول سے یہ مصنفہ آئی ہیں وہاں سے جست لگا کر وہ عصمت چغتائی نہیں بن سکتیں لیکن اُن کا رشتہ اپنی تہذیب، اپنی شناخت اور اپنے الفاظ سے اتنا مضبوط ہے کہ اپنے خواب وہ اسی زبان میں دیکھتی ہیں جو انہیں اپنے بزرگون سے ملی ہے اور ان ہی لفظوں کے دائرے میں وہ اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کی کائنات تعمیر کرتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے ورنہ وہ کسی پرائے رسم الخط میں لکھ کر زیادہ مقبولیت اور شہرت بٹور سکتی تھیں۔ وہ اپنے اردگرد کی ناہمواریوں، بدعنوانیوں، خود غرضیوں، اور استحصال کو دیکھ کر پریشان ہوتی ہیں اور یہ افسانے اُنہی کی زد

میں آئی ہوئی شخصیت کا اظہار یہ ہیں۔

'سراب' اس کتاب کا پہلا افسانہ ہے۔ جو سیدھے سادے خط مستقیم میں قصہ گوئی کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ سراب ایک ایسا استعارہ ہے جو اب کلیشے بن چکا ہے لیکن اس کی معنویت ختم نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لوازمات میں صحرا، پیاس اور پانی کے وجود کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جمیل مظہری کی مثنوی ''آب و سراب'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اے خیام کا ناول سراب منزل بھی ایک غیر ملکی معاشرے اور تہذیب کی عکاسی کرتا ہے اور مشرق و معرب کے جغرافیائی اور ذہنی فاصلوں کا ایک ایسا بیانیہ ہے جس کے اوراق میں انسان کے دکھوں کی داستان رقم کی گئی ہے۔ اور سراب کے نام سے حالیہ دنوں میں اسد واحدی مقیم امریکہ کا ایک ناولٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کا کلیدی کردار موجودہ تہذیب اور اسکی بے اعتدالیوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ نوشابہ خاتون کا افسانہ 'سراب' ایک بہت ہی مختصر افسانہ ہے جس کے کلیدی کرداروں کا کوئی نام نہیں دیا گیا ہے(۱) وہ(۲) اس کی بیوی اور (۳) اس کی بیٹی کے ارد گرد شروع ہوکر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ ایک سادہ لوح انسان جو اپنا سب آرام و آسائش تج کر مستقبل کی امید میں جیتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے بعد اس کو خوشحال دیکھ کر مطمئن ہوجاتا ہے۔ لیکن وہاں کی سچائیاں جب اس پر کھلتی ہیں تو وہاں سے واپسی کا سفر اختیار کرنے کو بے تاب ہوجاتا ہے۔ پردیس کی زندگی اسے راس نہیں آسکی اس کا تھیم (Theme) ہے۔ 'آشیاں اپنا' اور 'زندانی' میں اسی صورت حال کا ذکر ہے جس میں کردار، اور ان کے نام تو بدل دئے گئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہی دیسی، پردیسی اور زندگی کے مختلف اسلوب کی عکاسی کی گئی ہے۔ مغربی ملکوں میں جینے کا طریقہ ایسا بن گیا ہے کہ ہر فرد اپنے کام میں مصروف رہتا ہے آنے جانے

میں وقت ہی ضائع ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ مسلسل تھکن طاری کردینے والا عمل ہے۔ ان دونوں افسانوں میں گھر کی وہ مخصوص فضا یا خلوص میں ڈوبا ہوا اپنا پن نہیں ملتا۔ ان کے مرکزی کردار، جو عورتیں ہیں، اپنے بیٹوں کے یہاں نہایت شوق اور چاؤ سے روانہ ہوتی ہیں۔ لیکن بہو کا رویہ قدم قدم پر انہیں اندر ہی اندر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ خود کو عضو معطل بن کر رکھنا نہیں چاہتیں اور کرداروں کا داخلی تصادم ان افسانوں کو ان کے متوقع انجام تک لے جاتا ہے۔ ضعیفوں کے لئے گھر میں کوئی کام ہی نہیں ہے نہ ہی بہو ان کے کام کرنے کی خواہش کو خوش آمدید کہتی ہے۔ وہ اپنی سلطنت میں کسی بے جا مداخلت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ بیٹا دن بھر کا تھکا ماندا دو گھڑی صبح و شام آن کر خیریت ضرور دریافت کرلیتا ہے۔ لیکن پوتے پوتیوں کے ساتھ وقت گزارنے کی بھی حسرت ناکام ہوجاتی ہے۔ اُنہیں اُن کے قصے کہانیوں سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ ٹی وی پر کارٹونوں میں لگے رہتے ہیں۔ غرضکہ جس اُمید پر یہ مائیں اپنے بیٹوں کے پاس جاکر قیام کرتی ہیں وہ اُمیدیں چکنا چور ہوجاتی ہیں۔ وقت کی کمی کے ساتھ اپنی ذات تک محدود ہونے کا المیہ ہی ان افسانوں کی سچائی ہے۔

''انتظار'' میں ایک جوان لڑکی کی آرزوؤں کا قصہ بیان کیا گیا ہے، جو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہشوں سے لب ریز ہے۔ لیکن محرومیاں بچپن سے اس کا مقدر بنی رہیں۔ اُس کا چچا زاد جس کے ساتھ بچپن سے ایک ساتھ پلی بڑھی، اسے منہ نہیں لگاتا لیکن وہ اس کی چاہت میں گلے گلے تک ڈوبی ہوئی ہے۔ افسانے کا عروج اُس وقت دیکھنے کو ملتا ہے جب اس سے شادی کے باوجود وہ اس کے قریب نہیں آتا اور پھر کسی اور جگہ چلا جاتا ہے شاید اعلیٰ تعلیم کی خاطر۔ وہ لڑکی مایوس ہوکر نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کا ارادہ کرلیتی ہے لیکن کوئی

غیر مرئی طاقت اسے ایسا کرنے سے روک لیتی ہے اور وہ انتظار کرنے کے ایک نئے عزم کے ساتھ جینے کا ارادہ کرلیتی ہے۔ یہ افسانہ مثبت رویے کی عکاسی کرتا ہے اور اس کا یہی پیغام ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ نہ جانے کب وہ خوشیاں دامن میں بھرجائیں جن کا انتظار کبھی کبھی جان لیوا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک اور پہلو بھی ہے دبا دبا سا جس کی چیخیں نہیں ابھرتیں بلکہ دبی دبی کراہیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ ہے ایک مرد نہاد معاشرہ میں عورت کی ناقدری۔ شادی کے بعد بھی اس لڑکی کی ازدواجی زندگی مسرتوں یا خوشیوں کے رنگوں سے خالی ہی رہی یعنی اسے وہ جائز حق نہیں ملا جس کی وہ مستحق تھی۔ نسایت (femenism) کے اس زاویے کو بھی دھیان میں رکھئے تو اس افسانہ کا کینوس اور پھیل جاتا ہے۔

"زندگی جو اس طری گزری......" کا کلیدی کردار عرفان، نفسیاتی پیچیدگی کا شکار ہے۔ اس میں احساس برتری کے ساتھ انا پسندی تو ہے لیکن غالب عنصر سادیت پسندی (Sadism) کا ہے۔ اس لئے اس سے کسی کی نہ بن سکی۔ اپنی خالہ زاد نسیمہ کے رشتے سے انکار کے بعد بالآخر وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک تو ہوجاتا ہے لیکن بیوی کے ساتھ وہ نباہ کرنا ہی نہیں جانتا تھا۔ بات بات میں کیڑے نکالنا اور روز مرہ کی چخ چخ سے تنگ آکر وہ بے چاری میکہ سدھار گئی اور عرفان صاحب والدہ کے انتقال کے بعد اور تنہا پڑ گئے۔ شہر سے سبکدوشی کے بعد آبائی حویلی میں آباد ہوگئے۔ ان کے چڑ چڑے پن سے کوئی نوکران اُن کے یہاں مہینہ بھر سے زیادہ نہ ٹکتا۔ یہاں ان کے والد کے نمک خوار رمضانی میاں اُن کی خدمت میں لگ گئے۔ لیکن عرفان کی تنک مزاجی رمضان میاں کی پرتی پر اس طرح ٹوٹی کہ وہ لڑکی ہی اُن کو برداشت نہ کرسکی اور رمضانی میاں سے ایک

کرایہ کے مکان میں منتقل ہونے کی درخواست کرتے ہوئے عرفان صاحب کی برائی کرنے لگی۔ عرفان نے یہ سب سن لیا اور بالآخر ان کو حویلی کے پچھلے حصہ میں منتقل کرکے خود تنہائی کے اسیر ہوکر رہ گئے۔ عرفان کے کردار کو صرف چند واقعات کی روشنی میں ہی ابھارا گیا ہے لیکن ایسے لوگ ذہنی طور پر بیمار ہوتے ہیں اور کبھی بھی نہ خود خوش رہ سکتے ہیں نہ ہی کسی دوسرے کو خوش رکھ سکتے ہیں۔

''ضمیر کی عدالت'' میں بھی اسی طرح کے ایک احسان فراموش اور کینہ پرور شخص کا سامنا ہوتا ہے جس نے دوستی کے پردے میں بہت کچھ چھین لیا اور جب وہ بیماری سے نڈھال ہوکر انتہائی نگہداشت کیمرے سے معافی کا طلبگار ہوتا ہے تو افسانے کا دوسرا کردار جو کلیدی بھی ہے اور نیک سیرت کا حامل بھی اُسے معاف کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ حالانکہ اس بدنہاد شخص نے اس کی منسوب پھوپھی زاد کو بھی اس سے چھین لیا ہے اور اسے ہمیشہ نیچا دکھاتا رہا ہے۔ یہاں ان دونوں کرداروں کے باہمی توازن سے خوب و زشت کی باہمی کشاکش کا بیان ہوا ہے اور ایک نفسیاتی گرہ کھولی گئی ہے کہ کوئی انسان نہ تو مکمل طور پر برا ہوتا ہے نہ ہی ایسا کہ اپنی اصلاح کرکے بداعمالیوں کا کفارہ نہ کرسکے اس افسانے میں شعور کی رو کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے اور باہمی تخیلی مکالمے سے اس کی بنت کی گئی ہے۔ ''سحر ہونے تک'' میں بھی ایک ایسے شخص کی حکایت بیان کی گئی ہے جو بچپن میں اپنے بڑے بھائی کی زیادتیوں سے تنگ آکر گھر سے بھاگ جاتا ہے، اور پناہ اسے ایسی جگہ ملتی ہے جہاں پیشہ ور جیب کتروں کی تربیت ہوتی ہے اور انہیں اس فن کی عملی کاریگری میں لگایا جاتا ہے۔ یہ کام بچے جگہ بدل بدل کر وارداتیں کرتے رہتے ہیں اور اُن کا استحصال کرنے والا سردار اُن سے سختی سے نمٹ کر کام نکالتا رہتا ہے۔ بھیک مانگ کر بہ ظاہر یہ لوگ

چھوٹے موٹے جرائم پیشہ ہیں جو چوری اور ہاتھ کی صفائی کی بدولت پکڑے نہیں جاتے۔ جگہ بدلنے کے دوران وہ آخر اپنے گھر تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے حالات دیکھ کر دل برداشتہ واپس ہو جاتا ہے۔ اس کے غم میں اس کے والد فوت ہو چکے ہیں اور اس کے بھائی نے اس کی منسوبہ سے شادی رچالی اور وہ اللہ کی بندی اسی قید خانے میں جینے پر مجبور تھی۔ اس افسانے کے بھی کئی پہلو ہیں۔ کم سن بچوں سے پیشہ کرانا اور بہ ظاہر بھیک مانگ کر چوری کی وارداتیں انجام دلانا معاشرہ کے ایک بھیانک چہرہ کو درشاتا ہے تو یہاں بھی اولاد کی مناسب تربیت سے غفلت، بے جا لاڈ پیار اور ہر اولاد سے نابرابر سلوک کے ساتھ ساتھ عورت کی ازلی مجبوری ہی سامنے آتی ہے۔ ''معاہدہ'' ایک مطلوقہ عورت کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے کلیدی کردار ہیں شارق اور شرمین، جن کی پرورش ایک ہی گھر اور گھرانے میں ہوتی ہے۔ شارق بہت ساری خوبیوں کا مالک ہوتے ہوئے بھی شدت پسندی کا شکار ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی شرمین اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے اور جب وہ اسے ماں بننے کی خبر سناتی ہے تو وہ خوش نہیں ہوتا ہے اور حمل کو ضائع کرا دیتا ہے۔ اس کے خیال میں اولاد کی آمد زن و شو کے درمیان محبت کی تقسیم کے برابر تھی۔ اب دونوں کے درمیان ناچاقی بڑھ کر طلاق پر منتج ہو جاتی ہے اور شرمین ایک مطلوقہ کی حیثیت سے والدین کے گھر آجاتی ہے جو اسے سمجھا بجھا کر اسے دوسری شادی کے لئے تیار کرتے ہیں اور وہ ساجد کے گھر آجاتی ہے۔ لیکن ساجد شادی صرف اس لئے کرتا ہے کہ وہ شارق سے ایک معاہدہ کر چکا ہے کہ وہ شرمین کو طلاق دے کر دوبارہ اس کی زوجیت میں ڈال دے گا۔ لیکن شرمین اس کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے کہ وہ خود کو کوئی بے جان چیز نہیں سمجھتی ہے، جسے جس طرح چاہا استعمال کر لیا اور جہاں چاہا رکھ

دیا۔ آخر میں ساجد شارق کو صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہے۔ شارق اسے وعدہ خلافی کا طعنہ دیتا ہے۔ لیکن صورت حال کو تسلیم کر کے اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ جو محبت یقین اور اعتماد کے وہ برسوں میں حاصل نہ کر سکا وہ ساجد نے چند مہینوں میں کیسے حاصل کر لی؟ اپنی خامیوں کے احساس سے اسے کیا ملا یہ تو ظاہر نہیں ہو سکا لیکن بین السطور سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ شارق اپنی غلطیوں کی اصلاح کی جانب رواں ہو گیا۔ اس حکایت میں بھی عورت کے حقوق اور شریعت کے قوانین پر خاموش سوال کی گونج سنائی دیتی ہے اور سماج میں اس کی حیثیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

'چناؤ کا موسم' میں عصری صورت حال کی نمائندگی کے ساتھ ملک میں فرقہ واریت، سیاست میں زور آوروں کے روز افزوں مضر اثرات کا بیان ہوا ہے اور چناؤ کے دوران دو سیاسی جماعتوں کی جھڑپ میں اس کے کلیدی کردار بنٹی کی موت کے سانحہ کا بیان ہوا ہے۔ اس کے بوڑھے باپ کے لئے یہ صدمہ سہنے کی ہمت پر آفریں ہے کہ وہ جب بھی فرقہ واریت کا شکار ہونے کی خبر سنتا ہے تو صرف دعا اور کچھ کر نہیں سکتا۔ یہاں بھی بچوں کی تربیت اور سیاسی جماعتوں کی بے جا اور غیر قانونی سرگرمیوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

'آخری وعدہ' ایک ایسے بچے کی روداد ہے جسے بچپن میں ہی ماں باپ کی محبت نہ ملی اور وہ گھر کے نوکروں کے درمیان پلتا بڑھتا رہا۔ اس کے والدین کو اس کی جانب توجہ کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں بے حد مصروف رہتے تھے۔ اس پر مسز اذان کا خالہ زاد بھائی وہاں آ کر ان کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بہت شرارتی تھا اور دونوں میں نہیں بنتی تھی۔ تو وہ گھر کے باہر بنی ہوئی جھونپڑی میں رہنے والی عورت کے قریب ہو گیا جو اسے اپنی

شفقت سے شرابور کردیتی تھی۔ لیکن ایک دن اس نے اپنی نانی اور اس عورت کی باتیں سن کر یہ جان لیا کہ وہ اسی جھونپڑی والی عورت کی اولاد ہے اور اسے اس کی ماں نے ایک وعدہ کے تحت اس کی صلبی ماں سے مانگ کر اپنا بیٹا بنا لیا ہے اور اب اس کا وعدہ یاد دلا کر اسے کہیں اور جانے کے لئے مجبور کر رہی ہے۔ اگلی صبح وہ جھونپڑی خالی ہوگئی اور وہ تنہا رہ گئی۔ اس افسانے کے کرداروں کو کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔ اس کے بیانیہ میں بچوں کی شفقت سے محرومی اور والدین کے غلط برتاؤ کی حقیقت سامنے آتی ہے۔ اپنے فرائض سے پہلو تہی کر کے نہ جانے موجودہ دور کے مرد وزن کس طرف جا رہے ہیں۔ یہ سوال بین السطور گونجتا سنائی دیتا ہے۔

'ڈرامے کا ڈراپ سین' میں ساس بہو کے رشتے کو قبول نہ کرنے کی جہت سامنے آتی ہے اور بہو ساس کی حکمرانی حاصل کرنے کی تگ و دو میں غلطی سے اپنے شوہر نورنظر کو زہر پلا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ بدی کا انجام بدی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہا نہیں جاسکتا لیکن جس لڑکی کو بہت چاؤ سے گھر میں بیاہ کر لایا جاتا ہے وہ جلد ہی ماں بیٹوں کے رشتے میں تلخی ضرور پیدا کر دیتی ہے جبکہ دونوں کے حقوق کی پامالی نہ بھی کی گئی ہو تو وہ دونوں مل جل کر کیوں نہیں رہ سکتیں؟

اس افسانے کی تکنیک سیدھے سادے بیانیہ سے مربوط ہے اور افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہے لیکن نقطۂ عروج تک پہنچ کر افسانہ بالکل سپاٹ ہو جاتا ہے اور قاری کو صدمے سے دوچار ہی کرتا ہے۔

'یہ عشق نہیں آساں' ایک صاحبزادے کے عشق کی کہانی ہے۔ افسانہ نگار نے ان کا نام نہیں لکھا حالانکہ ان کے دوست راشد اور وہ صاحبزادی زیبی

اپنے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کا کلیدی کردار ہی راوی ہے اور صیغۂ واحد حاضر کے ذریعے وہ اپنی داستانِ عشق رقم کرتا ہے۔ جس کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ والد کی مخالفت اور عاق کرنے کی دھمکی کے بعد جب وہ زیبی کو صورت حال سے آگاہ کرکے اس کی مدد چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص سے شادی سے انکار کردیتی ہے جو خاندانی جائداد سے محروم ہوکر صرف اپنے بل بوتے پر جینا چاہتا ہے۔ قاری کی ہمدردی 'س' کے ساتھ ضرور ہوتی ہے لیکن ایک ایسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوکر اپنے آپ کو گنوا دینا بالکل غلط ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو صرف دولت کی خواہش مند ہے۔ لیکن وہ لڑکی آج کے دور کی پروردہ ہے اور اس طور سے جینا چاہتی ہے جہاں زندگی کی خواہش فوری طور پر پوری ہوجائے۔

'نموخالہ' ایک کم سن بچے کی گم شدگی کے خبر کے کہرام سے شروع ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ وہ ٹی وی پر کسی سے ...... میں کچھ دنوں سے اتنا مصروف تھا کہ اسے تن من کا ہوش نہیں رہا اور نہ جانے کس کے بہکاوے میں آکر وہ غائب ہوگیا۔ ٹنو کے بارے میں بس اتنی ہی بات بتائی گئی ہے۔ نموخالہ ہی اس افسانے کی کلیدی کردار ہیں جو ویسے تو راویہ کی ماں کی خالہ ہیں لیکن تمام محلّہ ٹولہ میں نمو خالہ کے نام سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔ وہ جب بھی روایہ کے گھر آتی ہیں تو کسی نہ کسی بہانے موجودہ تہذیب اور ٹی وی کلچر کے خلاف تقریر فرماتی رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں سماج کی جملہ برائیاں، قتل و غارتگری، اغوا، اور بے راہ روی اسی کی دین ہیں۔ ان کی باتیں کبھی ہنسی مذاق کا بھی موضوع بن جاتی ہیں۔ لیکن وہ اور زمانے کی پرورش یافتہ ہیں جب اقدار کی پاسداری تھی۔ لوگ دوسروں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ نمو خالہ کا کردار دراصل اجتماعی یادداشت یا اجتماعی لاشعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ پڑھی لکھی نہیں ہیں

لیکن جو باتیں انہیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہیں وہ انہیں آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا کام انجام دیتی رہتی ہیں۔ جس زمانے میں تعلیم عام نہیں تھی لوگوں کی ذہنی تشکیل انہی بزرگوں کے اقوال سے ہی ہوتی تھی جسے گھر گھر لیجانے کے لئے نمو خالہ جیسی عورتیں (اور مرد بھی) ہر جگہ نظر آتی تھیں۔

'قید ہوس' اس مجموعہ کا طویل ترین افسانہ دس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ جرم وسزا کے گرد گھومتا ہے۔ جہاں مجرم تو کوئی اور ہے لیکن سزا اس نرس کو مل جاتی ہے جو اپنی کم عمری کے باوجود معمر شیخ ابراہیم سے شادی کر لیتی ہے کہ دولت کے ذریعہ تمام عیش و آرام حاصل ہو جائے گا اور بود وباش کے لئے ایک بڑی کوٹھی۔ لیکن شیخ ابراہیم کا قتل ہو جاتا ہے اور حالات اسے مجرم بنا کر سزایاب کرا دیتے ہیں۔ لیکن مجرم اپنے ضمیر کے بوجھ تلے اقبال جرم کر لیتا ہے اور اسے قید سے رہائی مل جاتی ہے۔ لیکن اس کی جوانی کے آٹھ سال جو ضائع ہو گئے وہ کیسے واپس مل سکیں گے۔

جرم وسزا کے بین پہلو کے علاوہ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے انسان کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہوس اسے ایسے آزار میں مبتلا کر دیتی ہے جس میں آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے اور اسے اپنے عمل کے عواقب ونتائج کی شمہ برابر پروا نہیں ہوتی۔ لیکن جب سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہوس کی ترغیب میں آکر وہ کر گزرتا ہے تو پھر زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ یہ آج کے دور کا بڑا المیہ ہے کہ سماجی بندشوں اور معاشرہ کے اصولوں کو توڑ کر نفس کی غلامی میں ہر کوئی بے ضمیری کے اندھے غار میں ڈوبا ہوا ہے جہاں اسے دن کی روشنی نظر نہیں آتی۔

باقی افسانے بھی اسی قبیل کے ہیں، جن میں حالات کی زد میں بے سہارا، بے بس مرد وزن کی تلخی اور مصیبت بھری زندگیوں کو ہی موضوع سخن بنایا

گیا ہے۔ جیسے ذرا سی بھول میں ایک شادی شدہ جوڑے کو جب یہ انکشاف ہوا
کہ وہ دونوں ایک ہی عورت کا دودھ پی کر بڑے ہوئے ہیں تو پھر ان کا نکاح
ہی فسخ ہوگیا۔ اس کے بعد یوسف اور اس کی بیوی کی زندگی الگ راستوں پر
گامزن ہوکر خوشی سے خالی ہوکر رہ گئی۔ 'غرور کا دیمک' ایک اصلاحی افسانہ ہے
جس کا کلیدی کردار اپنی بیٹی کو اپنی زندگی کی روداد سنا کر بے جا غرور سے بچنے
کی صلاح دیتی ہے کہ اس میں مبتلا ہوکر اس نے اپنا بھرا ہوا گھر اجاڑ دیا اور
بیوی کی بات میں کیڑے نکال کر اس کو گھر چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

'جائے پناہ' ایک مجرم کے گرد گھومتا ہے کہ کسی طرح وہ ایک مجرم بن کر
جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک عمر تک بند رہا اور اب آزاد ہوکر کہیں بھی جائے
پناہ نہیں مل رہی ہے اور وہ دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

'تاوان' میں اس زمانے کا قصہ بیان ہوا ہے جب زمینداری اور
زراعت پیشہ سے منسلک لوگ اپنی جایداد کو تقسیم سے بچانے کی خاطر کم عمر لڑکوں
اور لڑکیوں کی شادیاں عمر رسیدہ لڑکیوں یا لڑکوں سے کرکے اپنی املاک کو تو
بچا لیتے تھے لیکن دو زندگی کو جہنم میں ڈال دیتے تھے۔ ایسا ہی ایک شخص اپنی چچا
زاد بہن سے نکاح کرکے ساری جائداد سے ہاتھ دھوکر دور چلا جاتا ہے۔ ایسا
اس نے صرف اس لئے کیا کہ وہ اپنی منکوحہ کو ہمیشہ بڑی بہن کے درجے پر فائز
کرکے دیکھتا رہا اور انہیں کبھی بیوی کی طرح نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن اپنے چچا
کی ضد کے آگے اس نے سب کچھ تج دیا۔

ان تمام افسانوں میں نہ تو ابلاغ کا مسئلہ ہے نہ ہی علامتیت یا
تجریدیت کی زد میں آکر انہیں چیستاں بنادیا گیا ہے۔ یہ عام انسانوں کے
روزمرہ کے دکھ سکھ اُن کی خواہشوں اور حسرتوں کے قصے سناتے ہیں۔ مصنفہ نے

جو کچھ دیکھا ہے اور اپنے اردگرد وقوع پذیر ہوتے رہنے کا مشاہدہ کیا ہے انہی پر اپنا قلم اٹھایا ہے۔ ان میں موجودہ رویئے سے متاثر انسانوں کے بدلتے ہوئے چولے کو چاک کرکے ان کی بدصورتی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ درمیانہ طبقے اور نچلے درمیانہ طبقوں کی عکاسی کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ پس ماندگی کے ساتھ بدحالی کا شکار بھی ہے۔ خاص کر آزادی کے بعد کم وبیش ان ہی طبقات (Class) تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور جو لوگ اونچی سوسائٹی میں رہتے ہیں وہ عام معاشرے سے اس طرح کٹ کر رہ گئے ہیں کہ ان کا شمار بالکل الگ تھلگ دنیا کے باسیوں میں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ ہماری نمائندگی نہیں کرسکتے کہ ہم میں اور ان میں جسمانی فاصلے ہی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسیاتی دوریاں بھی حائل ہیں۔

مصنفہ نے کسی قسم کی نعرہ بازی یا طبقاتی کش مکش کو مطلق لایق اعتنا نہیں سمجھا نہ ہی جدیدیت کی بے راہ روی جس نے افسانہ کو اس کے قاری سے دور کرکے رکھ دیا، کو بھی نامنظور کردیا۔ ان میں ایک بے باک حقیقت پسندی کا عنصر کہیں موج تہ نشیں کی طرح تو کہیں سطح پر اپنی موجودگی کی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ بات بھی محسوس کی جاسکتی ہے کہ ان میں اجتماعیت کا لبادہ اوڑھ کر نعرہ بازی نہیں کی گئی ہے بلکہ انفرادی مسائل اور مشکلوں سے جھوجھتے ہوئے عام انسان کے بے رنگ و نور نقوش ہی ابھار گئے ہیں۔

بین السطور ایک اور دکھ بھری آواز سنائی دیتی ہے جو ٹوٹتے بکھرتے ہوئے انسانی رشتوں خاندانی روایتوں اور گھر کی داخلی تہذیب و ثقافت کی گھٹی گھٹی چیخوں سے ابھر کر آہوں میں ڈھلتی ہے اور کبھی کبھی کراہوں میں سماعت ہی بارگراں بن جاتی ہے۔ مذہب سے اب وہ تعلق خاطر کم ہی نظر آتا ہے جو

روحانیت کو فروغ دیتا تھا۔ کوئی بندہ بھی ہوس کی غلامی سے نجات کے لئے خود سے یعنی اپنے نفس اور اپنے ماحول سینبر د آزما ہوجائے تو یہ معاشرہ کے لئے فال نیک ہے۔ ایسا ہی ایک کردار ہے 'تاوان' کا 'میں' جو خود ہی اس افسانے کا روای ہے اور واحد متکلم کی صورت میں قاری سے ہمکلام ہوتا ہے۔ لیکن یہ شاید اگلے وقتوں کی داستان پارینہ ہے کہ آج کے دور میں تو ادھوار سفر کی 'مونی' کا کردار سامنے آتا ہے یا 'جائے پناہ' کے بے نام کردار 'وہ' کا جو ذرا سی بات پر خون کر دیتا ہے اور طویل مدت تک قیام کے بعد قید خانہ سے نکل کر بے پناہی میں آسرا تلاش کر رہا ہے۔

عصری حسیت کے یہ نمونے نن میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر خارجی شعور کی گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کسی نظریے کے تحت وجود میں نہیں آتے ہیں۔ نہ ہی ان میں وہ منظم پلاٹ، واقعہ سازی اور کردار نگاری کا سراغ ملتا ہے جو ہمارے ممتاز افسانہ نگاروں کی خصوصیت میں شامل رہے ہیں، نہ ہی کوئی وسیع تفکر کی آنچ محسوس ہوتی ہے لیکن جو نئی طرز حیات ہم پر حاوی ہوتی جارہی ہے اس کے متعلق کہیں کہیں اشارے کنائے ہیں تو بسا اوقات بہ بانگ دہل اس کے خلاف چنگاریاں اڑتی ہوئی ضرور نظر آتی ہیں۔

بچوں اور والدین کے درمیان بھی فاصلے اور ان کی تربیت میں کوتاہی یا ان سے بے نیازی کی طرف بھی مصنفہ نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ گویا وہ قدیم سماجی اقدار اور روایات کے مثبت نکات کی جانب اشارے کرتی ہیں۔ ان دنوں بچے بڑے ہوکر مردانے میں رہ کر تربیت پاتے تھے اور ان کے مشاغل میں تعلیم کے ساتھ جسمانی افزایش کثرت ورزش اور پہلوانی کو بھی اہمیت حاصل

تھی اور لڑکیاں گھر میں سینے پرونے پکانے رینڈھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ گرچہ ان کی تعلیم اسکول کالج میں نہیں ہوتی تھی لیکن وہ گھر میں رہ کر ہی اردو فارسی کی اچھی لیاقت حاصل کرلیتی تھیں۔ ان افسانوں کو کسی نظریے کے تحت یا نظریاتی ادب کے خانے میں رکھ کرنہیں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان میں جگہ جگہ صنفی دیواریں ضرور نظر آتی ہیں۔لڑکیوں کو ان کا جائز حق نہیں دیاجاتا تو ان کا گھٹن محسوس کرنا اور فطری تقاضوں سے جبر کے ذریعہ بیگانہ کرنے کی کوشش کو بھی نظر انداز نہیں کیاجاسکتا۔ جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہوا کہ ان میں تانیثی نقطہ نگاہ (feminist view) بھی۔ 'انتظار' اور 'معاہدہ' میں ان کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس طرح تانیثیت کہیں کہیں واشگاف لہجے میں قاری سے سوال طلب کرتی نظر آتی ہے کہ مرد نہاد معاشرہ میں عورت کی حیثیت میں اب بھی بہت کم فرق آیا ہے بھلے وہ پاؤں کی جوتی نہیں رہ گئی ہوں لیکن وجودی کش مکش میں شکست خوردگی ہی اس کی شخصیت کو بے شناخت کرتی نظر آتی ہے۔ ایک عورت سے دوسری عورت کے رشتے کو بھی معمول کی زندگی میں رخنہ اندازی کرتے دکھایا گیا ہے جو ان کو آئے دن کے وقوعے میں دیکھنے کو ملتے رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے بارے میں حتمی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن حسد اور رقابت کا مادہ ان کے لہو میں زیادہ ہی موجود رہتا ہے۔

مصنفہ کے اسلوب زبان اور مواد میں بہتری کی توقع کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

حرفِ اعجاز

ـــــــ ڈاکٹر منظر اعجاز
سابق پروفیسر وصدر پوسٹ گریجوئیٹ
شعبۂ اردو
پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ-۸۰۰۰۲۰

نوشابہ خاتون زمانۂ حال کی خواتین افسانہ نگاروں میں نمایاں اور مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ معروف و ذی وقار بھی ہیں۔موقر رسائل و جرائد میں ان کے افسانے متواتر شائع ہوتے رہے ہیں ۔دو مجموعے ''نقار خانہ''اور''بالا دست'' شائع ہو چکے ہیں ۔ان کے علاوہ ایک معاشرتی ناول نیا شوفر بھی منظر عام آچکا ہے۔تیسرا مجموعۂ افسانہ ''خلیج'' عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے۔ان کا ایک سوانحی ناول ''خزاں کے بعد'' بھی زیرِ طبع ہے۔اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی جولانیِ طبع اور قلم کی رفتار سست اور دھار کند نہیں ہوئی ہے۔میرے خیال میں انہوں نے خود کو ادبی تحریک یا رجحان سے بھی آزاد رکھا ہے۔تخلیقی وجدان کی رہنمائی اور معاشرے میں پھیلے واقعات و واردات کے مشاہدات و تجربات کے تانے بانے سے کہانیاں بنتی رہی ہیں۔ان کہانیوں سے حیات و کائنات اور معاشرتی مسائل و معاملات کے سلسلے میں ان کا زاویۂ نظر واضح ہوتا رہا ہے جو غیر منظم اور غیر مرتب صورت میں یا بکھرا بکھرا سا دکھائی دیتا

ہے لیکن ان بکھرے عناصر کو ترتیب دے دیا جائے تو وہ ایک فلسفۂ حیات بن سکتا ہے اور اس لحاظ سے سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔اس پہلو پر تفصیل سے لکھنے کے لئے جتنے صفحات و اوقات کی ضرورت ہے،وہ سرِ دست میسر نہیں،اس لئے یہاں اس پہلو سے گریز لازم ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی ادیب یا فنکار کے لئے خرد کے نظریات سے زیادہ اہم اس کے اپنے مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں۔مشاہدات کا تعلق دیکھے ہوئے اور تجربات کا تعلق بھوگے ہوئے یا جھیلے ہوئے واقعات و واردات سے ہے۔پچیس افسانوں پر مشتمل ''خلیج'' میں دونوں طرح کے واقعات و واردات اور مسائل و معاملات عکس ریز ہوئے ہیں جن کا بیان خوش سلیقہ اسلوب اور عظیم آباد، پٹنہ کے مضافات بالخصوص ضلع نالندہ کے شرفاء گھرانے کی خواتینِ خانہ کی زبان میں ہوا ہے۔یہ وضاحت شاید یہاں غیر ضروری نہ ہو کہ ادب کا سارا کھیل زبان و بیان ہی پر منحصر ہوتا ہے اور کوئی بھی ادبی متن یا ادب پارہ سب سے پہلے زبان و بیان ہی کی وجہ سے متاثر کرتا ہے اور مطالعے کے ذوق کو شوق کی راہ پر ڈالتا ہے۔کم از کم میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ''خلیج'' کے مطالعے میں سب سے پہلے میری توجہ نو شابہ خاتون کے اسلوبِ بیان اور اندازِ زبان ہی کی طرف مبذول ہوتی ہے۔اس لئے میں یہاں مختلف افسانوں سے چند اقتباسات پیش کرنے پر مجبور ہوں۔

''اماں جی ! آپ ایک طرف چپ چاپ بیٹھی رہیئے۔کاہے کو بک بک کیجیے ہے'' (آشیاں اپنا)

''امی آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔آپ سے کچھ ہوتا جاتا نہیں ہے۔سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہیں'' (زندان)

''کبھی کبھی وہ باورچی خانہ میں جا کر نوکرانیوں سے گپ لڑاتی، ان کے کام میں مدد کرنے کی کوشش کرتی

''بنفشہ بوا آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''نہیں دلہن بیگم کئی روز سے بخار آرہا ہے۔''

''ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''کہاں اتنا پیسہ ہے۔ اکیلی جان چھ چھ بچوں کا خرچ چلانا آسان ہے کیا موا نکما بیٹھ کر کھانے والا ہے۔'' (ڈرامے کا ڈراپ سین)

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بغیر پیسے، بغیر عیش و آرام کے تمہارے ساتھ سڑکوں پر دھکے کھاتی پھروں گی۔ نا بابا نا، میں ایسے خالی خولی عشق کی قائل نہیں ہوں۔'' (یہ عشق نہیں آساں)

''کا بتاویں بیٹا۔ اب تو نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ پیار محبت رہا۔ تم لوگوں کو اتنے دنوں بعد دیکھ کر کا بتاویں کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ بیٹھو کھانا بناویں ہیں۔ کھا کے جیو۔ (خواب خواب زندگی)

افسانہ نگاری میں جملہ سازی اور فقرہ طرازی کی جو اہمیت ہے، اس سے افسانے کے قارئین اور ناقدین واقف ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش بھی نہیں۔ ویسے بھی مرصع نگاری ہر صنفِ ادب بالخصوص تخلیقی اور افسانوی ادب کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ مرصع نگاری کی خصوصیات میں صرف قافیہ پیمائی ہی لازمی عنصر نہیں، محاورے ترکیبیں اور تشبیہیں بھی عبارت آرائی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ تصنعِ، وضعیت اور بناوٹ کا انداز واضح نہ ہو۔ بے

تکلفی، بے ساختگی، شگفتگی اور والہانہ پن ہو۔ایسی خصوصیات نوشابہ خاتون کے افسانوں بالخصوص افسانوی زبان و بیان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔زبان کا وہ معیار جو مرزایانِ دہلی یا اردوئے معلیٰ سے مخصوص و منسوب رہا ہے، کچھ اسی قسم کا معیار عظیم آباد، پٹنہ اور مضافات کی حویلیوں کی زبان کا بھی رہا ہے اور نوشابہ خاتون کا براہِ راست تعلق ایسی حویلیوں سے رہا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حویلی والیوں میں رہی ہیں اور افسانہ نگار، ناول نویس یا ادب نگار کی حیثیت سے اس معاشرے کی روشن شمع ہیں۔ مجھے اس مخصوص خطے میں ان کے سوا دورِ حاضر میں کوئی دوسری خاتون نظر نہیں آتیں، جن کی زبان ایسی ہو اور جن کا معیارِ زبان و بیان ایسا ہو۔ چند فقروں اور جملوں سے میرے اس خیال کی تائید و توثیق ہو سکتی ہے۔ مثلاً ''صحرا جیسی ویران آنکھیں ۔'' یہاں توجہ طلب آنکھوں کی ویرانی ہے، جسے صحرا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ایک جملہ اور دیکھیں۔

''اگر کسی کے دل میں درد اٹھتا بھی ہے تو بس اتنی دیر کے لئے جتنی دیر چکنے پتھر پر پانی ٹھہرتے ہیں۔''

مشاہدے کی باریکی ،نظر کی گہرائی اور گیرائی اور جملے کی ساخت و پرداخت اور جدت و ندرت کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ایسے ایسے بے شمار فقرے اور جملے ہیں جن سے نہ صرف زبان وبیان کا معیار مترشح ہوتا ہے بلکہ ان کی پور پور سے شعریت سی ٹپکتی محسوس ہوتی ہے۔

نوشابہ خاتون اپنے افسانوں کا آغاز بھی اچھوتے انداز میں کرتی

ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلم کی سمت ہی نہیں ہے،رفتار بھی ان کے دست قدرت کی رہینِ منت ہے۔ان کے افسانوں میں تمہید کی عدم موجودگی احساس دلاتی ہے کہ وہ کسی منصوبہ بندی کے تحت یعنی Planned way میں تمہید رقم نہیں کرتیں جیسے ریگ زاروں میں پانی کا سوتہ کہیں بھی اور کبھی بھی پھوٹ پڑتا ہے اور صحرا نوردوں کی آسودگی کا سامان بن جاتا ہے۔اور نظامِ قدرت کے کرشمے جلوۂ طور کا منظر چشمِ تصور میں بھر دیتے ہیں۔نوشابہ خاتون کی قدرتِ فن بھی کچھ اسی انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔افسانہ ''خلیج'' کے ابتدائی چند جملے دیکھیں:

''بچی رو رو کر بے حال ہورہی تھی۔''پاپا !پاپا میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''
بس اس کی یہی ایک گردان تھی ۔لیکن وہ مجبور تھا۔ دل پر ایک بھاری بوجھ لئے رومال سے اپنے آنسو خشک کرتا ہوں،اسے خود سے جدا کر دیا تھا۔ رومانہ نے بھی اپنی آنکھوں میں بے ساختہ اُمڈ آنے والے آنسو کو بڑی مشکل سے روکا اور اسے خدا حافظ کہا۔''

معاہدہ کا پہلا پیراگراف بھی دیکھتے چلیں:

''تو آخر وہی بات ہوئی جس کا اسے ڈر تھا۔ایک پل میں سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے۔سارے عشق ،سارے جنون ہوا ہو گئے۔
یہ ذات ہی بے اعتبار ہے ۔نہ اس کی محبت میں پائیداری ہے،نہ وفا میں خلوص،عورت اس کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔جب جی چاہا کھیلا،جب دل بھر گیا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔''

''جب بھی میں اس جھونپڑی کے پاس سے گزرتا،میرے قدم رک جاتے۔نہ جانے اس عورت کے چہرے میں کیا بات تھی کہ دل خود

بخود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا۔کوئی انجانی سی طاقت مجھے اس راستے
سے ہو کر گزرنے پر مجبور کر دیتی۔“

محولہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے بعض دوسری خصوصیات کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ دوران مطالعہ ابتدائی مرحلے میں ہی قاری کے ذہن میں تجسس کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ متجسسانہ تشنگی کے ساتھ آگے کے مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔یہاں تک کہ اختتام تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔اس کی ایک اہم وجہ ”خلیج“ کے افسانوں کا اختصار بھی ہے۔اس مجموعۂ افسانہ کا غالباً طویل تر افسانہ ”قیدِ ہوس“ ہے لیکن اس کی قرأت میں بھی ایک گھنٹہ سے کم ہی وقت صرف ہوتا ہے۔

”خلیج“ کے افسانے طویل ہوں یا مختصر، ان کے بیانیہ میں سادگی و پرکاری دکھائی دیتی ہے۔کوئی پیچیدگی نہیں جو بیشتر جدیدیت کے رجحان سے متاثر افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔لیکن افسانوں کے پلاٹ میں جن واقعات و واردات کی ہم کاری اور پیوند کاری کی گئی یا جن کے تانے بانے سے پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔ان میں بعض ایسے معاملات و مسائل سے الجھنے اور سلجھانے کی فنکارانہ کوشش ملتی ہے، جہاں تک عام لوگوں کی نظر تو کیا، خاص لوگوں کی نظر بھی شاید ہی پہنچتی ہو۔مسائل و معاملات بہر حال سماجی ہی ہیں کہ کسی نہ کسی سماج میں خواہ وہ ہندو سماج ہو یا مسلم سماج یا مشترکہ تہذیب پر مشتمل مخلوط معاشرہ جس میں بعض مسائل کی گتھیاں اس طرح الجھتی ہیں کہ ہوش ٹھکانے لگ جاتے ہیں۔مثال کے طور پر ”شجرِ ممنوعہ“ کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔اس افسانے میں اسلامی معاشرے کا ایک ایسا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔جس پر کوئی افسانہ یا ناول آج تک میری نظر سے نہیں گزرا چنانچہ میرے نزدیک یہ

ایک اچھوتا موضوع ہے۔افسانے کے بیان میں سادگی ہے لیکن مسئلہ پیچیدہ ہے۔اس کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں نازو اور یوسف پندرہ سال بعد ملتے ہیں:

''پورے پندرہ سال بعد ہم دونوں ملے تھے۔چند لمحے دونوں ہی خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔پھر اس خاموشی کو یوسف ہی نے توڑا۔''

اس مختصر سی عبارت سے ہی تجسس ابھرنے لگتا ہے اور متجسس نگاہیں آگے قدم بڑھاتی ہیں:

''نازو تم یہاں؟''پھر قدرے توقف کے بعد انھوں نے افسردگی سے پوچھا۔''کیسی ہو؟''اس مانوس سی آواز نے میرے اندر ایک ہلچل سی مچا دی۔پھر خود کو سنبھال کر کہا:''اچھی ہوں اور جینے کا سہارا ڈھونڈنے یہاں آئی ہوں۔

تجسس کا عنصر ہنوز برقرار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر اس کا مدار اسی پر ہے۔واقعہ یہ ہے کہ پندرہ سولہ سال قبل یوسف ،نازو کو آتے جاتے دیکھا کرتا تھا لیکن اس دید و باز دید میں شرافت کی بو باس موجود تھی۔اس کے باوجود نازو نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ایک دن کالج سے واپس آئی تو گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔والدین کو شادی کی فکر تو پہلے ہی سے تھی ،رشتے کو معقول سمجھ کر قبول کر لیا گیا اور نازو کو یوسف میاں سے بیاہ دیا گیا۔دونوں کی زندگیوں میں بہار آگئی۔یوسف کی جہاں پوسٹنگ تھی وہاں نازو کو ساتھ لے گیا۔میکے بھی نازو آتی جاتی رہتی۔

لیکن جب ایک بار یوسف نے گھر میں قدم رکھا تو ایک عورت ان کے

ساتھ تھی جو پاکستان سے آئی تھی۔ دونوں کے بعد کچھ اور لوگ ملنے جلنے آئے انہیں نے انکشاف کیا کہ یوسف نے اس عورت کا دودھ پیا تھا جس کا نازو نے پیا تھا۔ چنانچہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے شجر ممنوعہ بن گئے۔

اس مسئلے سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ بھی مزید پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے اور وہ ہے نازو کی کوکھ میں پلنے والا یوسف کا نطفہ۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ اس صورت حال میں نازو کی کفیت کیا ہوگی؟ نازو بالآخر حمل ساقط کرادیتی ہے۔ اور پھر دوسری شادی بھی نہیں کرتی۔ پندرہ سولہ سال جیسے تیسے گزارنے کے بعد مستقبل وحال کا سہارہ ڈھونڈتے وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں اچانک یوسف سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

یوسف بھی اس ملال میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں کہ اب پوری زندگی کیسے گذرے گی؟۔ یوسف کی یہ کفیت نازو کو اور بھی ملول کر دیتی ہے۔ کہانی اپنے اختتام پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ایک ذراسی بھول سے دو زندگیوں میں ایسا زہر گھل گیا جس کا کوئی توڑ نہیں۔

ایک دوسری کہانی ''انتقام'' بھی مسئلے کی پیچیدگی کے لحاظ سے ایسی ہی ہے۔ حالانکہ اس کے اصل موضوع میں عمومیت ہے۔ ضبط حمل یا ضبط تولید کا مسئلہ نیا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تو سرکاری سطح پر بھی تحریک چلائی گئی ہے لیکن اس افسانے میں اولاد کی کثرت سے عاجز آکر ضبط حمل کے نسخے آزمائے جاتے ہیں۔

اس افسانے کا واحد متکلم راوی اپنی بے خواب وبے قرار راتوں اور جگر کے پار ہو جانے والی خلش کی داستان بیان کرتے ہوئے اس موڑ پر آتا ہے۔ جہاں دھندلی دھندلی یادیں ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں ان میں ایک

شبیہ صائمہ کی ہے۔ جو میری ہمسفر اور غمگسار تھی۔ بچپن میں میرے پیارے دوست، اپنے پرائے مجھے چھیڑ کے میری مجروح شخصیت کا مذاق اڑاتے تو وہ ڈھال بن جاتی۔ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار ہو جاتی''۔

راوی کے اس بیان سے مترشح ہے کہ صائمہ اسے پیار کرتی تھی۔ آگے بڑھتی ہوئی کہانی احساس دلاتی ہے کہ، وہ ابھی بھی اسے چاہتی ہے۔ لیکن اسکی زندگی میں شامل نہیں ہوسکتی۔ یہ اسکی مجبوری تھی۔ اور ہے۔ راوی کا یہ بیان اس کے دل کی لگی اور جگر کی خلش کا عکاس ہے۔:

''میرے اندر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش تھی، کسی ہمسفر کی آرزو تھی جو میری تنہائی کی شریک ہو، مجھ سے راز و نیاز کی باتیں کرے باتیں، کبھی پیار کی باتیں اور کبھی تکرار کرے۔''

راوی کے بیان سے ہی واقعات وواردات کے نشیب وفراز ظاہر ہوتے ہیں۔ راوی ہی اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور وہی اپنی روداد حیات بیان کرتا ہے اور اسی سے اسکی کیفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جس کی بے شمار خواہشیں، اور فطری خواہشیں ہیں۔ جو احساس دلاتی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلا جا رہا ہے۔ بیان کی کیفیت قاری کو بھی اکثر گھٹن میں مبتلا کرتی ہے۔

کردار کی سعادت مندی، اس کی خاندانی نجابت اور شرافت کا احساس دلاتی ہے۔ اور واضح ہوتا ہے کہ وہ جس تہذیبی روایت اور روایتی معاشرے کا زائیدہ وپروردہ ہے وہ تصور خدا اور اس کی قدرت کاملہ کا معتقد ہے اور یہی اعتقاد اسے زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ وہ خودکشی کر کے جان دے دیتا یا ایسے اقدام کرتا جو خاندان کے نام کو بٹہ لگا دیتا۔ وہ اپنے احساس کے عفریت سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود کو مطالعے میں مشغول رکھتا ہے جو بظاہر ایک

فراری میلان ہے۔لیکن یہی چیز اسے زندگی سے رشتہ استوار رکھنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے اور زندگی سے پیچھا چھڑا کے بھاگنے نہیں دیتی۔اس کی سعادت مندی کا اظہار اور اسکے ابو کا اعتراف ملاحظہ ہو:

''میں اپنی لائبریری میں محو مطالعہ تھا کہ اچانک ابو اندر داخل ہوئے۔ انکی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر حزن وملال چھایا تھا۔آتے ہی انہوں نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

'بیٹا میں تمہارا دکھ جانتا ہوں۔تمہاری محرومی کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں ہی تمہاری خوشیوں کا قاتل ہوں۔ بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔بچے کبھی نعمت ہوتے ہیں اور کبھی زحمت بھی بن جاتے ہیں۔اہل وعیال کی کفالت کرتے کرتے میری کمر ٹوٹ گئی تھی۔شاید میرے بزرگوں نے یہ دعا دی تھی۔''دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔''

''دودھوں نہانا تو نصیب نہ ہوالیکن خدا نے اولاد کی دولت سے جی بھر کے نوازا۔جب مجھے خبر ہوئی کہ ایک بچہ اور میرے گھر آنے والا ہے تو میرے ہوش اڑ گئے مزید اور بوجھ اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہ تھی۔میں کسی صورت اس بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔۔۔

''لیکن یہ کہاوت سچ ثابت ہوئی کہ'' جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے''۔

چنانچہ اسقاط حمل کی تدبیروں کا بھی حسب دل خواہ نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ اس کے مضر اثرات کی وجہ سے عضو خاص ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔یہ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی۔

اپنے باپ کے احساس گناہ اور اقبال جرم پر افسانے کے اس کردار کا

جو ردعمل ہونا چاہئے تھا وہ دکھائی نہین دیتا اور یہی اس کے سعادت مند ہونے کی دلیل ہے۔اس کا آخری بیان جس پر اس افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔یہ ہے:

''میں حیرت وحسرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

کیا کوئی اولاد بھی اپنے والدین پر بوجھ بن سکتی ہے؟''

اور پھر میری نظریں کسی معجزہ کی امید میں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔''

متذکرہ بالا افسانوں میں مرکزی کرداروں کو جن حالات سے گزرنا پڑا ہے،ان میں ہوش وحواس کا بجا رہنا حیرت انگیز ہے لیکن اعتقاد واقدار کی ان دیکھی قوت کی ایسی کارفرمائی ہے جس نے زندگی کے شیرازے کو بکھرنے سے بچا لیا ہے۔لیکن زندگی کے ارتقائی سفر میں جو خلیج پیدا ہوئی ہے،وہ پٹ نہیں سکی ہے۔ایسی خلیج معاشرتی سطحوں پر کئی جگہ دکھائی ہے۔ایک افسانہ بھی ''خلیج'' کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل ہے، اوریہی سرنامۂ کتاب بھی ہے۔اس خلیج کی نوعیت متذکرہ افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔

اس افسانے میں رشتوں کے درمیان سیاسی خلیج دکھائی دیتی ہے۔ناقابل عبور خلیج !وہ خلیج جو تقسیم ملک سے پیدا ہوئی تھی ۔زمین بٹ گئی تھی،آسمان بٹ گئے تھے،خاندان بٹ گیا تھا۔رشتے بٹ گئے تھے۔اگر بٹنے سے کچھ رہ گیا تھا تو وہ تقسیم ہند کا المیہ تھا جس نے دونوں طرف سینے کے داغ کو تازہ رکھا تھا۔اوریہی آمدورفت اور ملاقات بات کا جواز تھا۔خلیج کے کردار اس المیہ کے شکار ہوتے ہیں۔رومانہ کسی تقریب سعید میں شرکت کے لئے انڈیا آتی ہے۔یہاں آکر وہ اپنے کزن احمر کی پسند بن جاتی ہے۔فاصلے اور خلیج کے احساس کے باوجود حسب روایت بزرگوں کے فیصلے کے مطابق شادی ہو جاتی

ہے۔ تین مہینے کا ویزا ختم ہونے پر آتا ہے تو بار بار بڑھوایا جاتا ہے۔شہریت حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رہتی ہے،اس طرح کہ رومانہ کو انڈیا کی یا احمر کو پاکستان کی شہرت مل جائے۔اس تک ودو کے درمیان رومانہ ایک بچی کی ماں بن جاتی ہے۔

اس افسانے کا جو کلائمکس ہے وہی اس کا المیہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک نوٹس کے ذریعے اسے انڈیا چھوڑ دینے کا فرمان ملتا ہے اور لا محالہ اسکی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔

فنی تکنیک کے لحاظ سے افسانے کی ابتدا کراچی کے لئے پرواز سے ہوتی ہے جس کا اختتام کراچی ایرپورٹ پر لینڈنگ سے ہوتا ہے کہانی فلیش بیک کی تکنیک میں اپنا سفر کرتی ہے۔

''تاوان'' کی کہانی بھی الم انگیز تاثرات سے لبریز ہے ہر چند کہ یہ آج کی کہانی نہیں لیکن جاگیردارانہ نظام اور سماجی حقیقتوں کی عکاس ہے۔ماضی بعید اور اس کی تاریخ میں ایسے انگنت اوراق ہیں جن میں رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی ''خلیج'' کا تعلق معاشی نشیب وفراز ہے۔

اس کہانی کا راوی واحد متکلم ہے اور یہی اس کا مرکزی کردار بھی ہے۔حسب معمول اس کہانی کا آغاز بھی تجسس آمیز ہے:

> ''کئی مہینوں کی ذہنی کشمکش اور انتشار کے بعد آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔فیصلے کی گھڑی بہت کٹھن تھی لیکن دل کے اوپر سے بھاری پتھر سرک گیا تھا۔''

راوی اپنا خاندانی پس منظر یوں بیان کرتا ہے:

> ''میں اس گاؤں کا باشندہ تھا جو ایک روایتی گاؤں ہے۔اس کا اپنا

ایک الگ ہی رکھ رکھاؤ تھا ۔رعب تھا دبدبہ تھا۔ وہاں کے رؤساء اور سابق زمینداروں کے خلاف پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ہماری بلند وبالا حویلی اپنیجاہ وجلال کے اعتبار سے پورے گاؤں میں بے مثال تھی ۔میرے والد جوانی ہی میں ملک عدم کو سدھار گئے تھے لہٰذا نظیر احمد صاحب یعنی میرے بڑے ابو ہی ساری دولت اور جائداد کے مختار کل تھے۔''

سابق زمیندار نظیر احمد صاحب ساری دولت اور جائداد ہی کے نہیں بلکہ اپنے چھوٹے بھائی کی وراثت کے علاوہ وارث کے بھی سر پرست ونگراں اور مختار کل تھے ۔اور انکے حکم سے سر مو اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔انہونے اپنے بھتیجے سے اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ طئے کر دیا جب کہ لڑکی لڑکے سے عمر میں کافی بڑی تھی لیکن مسئلہ عمر کے اس طویل فرق کا نہ تھا۔بقول راوی:

''جو سزا مجھے ملی تھی اس میں اس ہستی کو شریک کرنا مجھے گوارا نہ تھا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ،سب سے زیادہ پیاری تھی۔جس کا دامن پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا تھا۔جس نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی تھی ۔جس نے میرے بکھرے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔اگر رشتوں کے شکنجے میں جکڑا اور احسان کے بوجھ سے دبا ہوا میں اتنا بے بس نہ ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی ۔میری بزدلی اور سعادت مندی نے مجھے بہت دکھ دیئے۔''

شادی میں آڑے آنے والا مسئلہ لڑکے کے لئے نہ عمر ہے نہ رشتہ جو معاشرتی طور پر ظاہر ہے لیکن ہے بہر طور رشتہ ہی جس کی نوعیت مختلف ہے۔جیسا کہ راوی کے اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

''پورے پانچ سال تک وہ اس حویلی اور ماں باپ کے دل پر تنہا راج کرتی رہیں آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنی رہیں۔ انکی ہر خواہش زبان سے نکلتے ہی پوری ہو جاتی۔ انکے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا رہتا لیکن جس دن میں آیا انہوں نے سارے کھلونے پھینک دیئے۔

انہیں تو وہی گڈا چاہیئے تھا جو چھوٹی امی کی گود میں تھا۔ وہ ہر وقت ان کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتیں۔ بچے کو گود میں لینے کی ضد کرتیں۔ کبھی نظر بچا کر بچے کا منھ کھول کر دیکھتیں اور کبھی آنکھیں۔''

''جب میں پانچ سال کا تھا تو ایک ناگہانی حادثہ میں میرے ابو امی چل بسے۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا تھا۔ میں رو رو کر بے حال ہو جاتا۔ ان کے پاس جانے کی ضد کرتا۔ پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتا۔ ایسے میں بڑے ابو اور بڑی امی نے مجھے گلے لگا لیا اور آپا کا دامن تھامے ان کے پیچھے لگا رہتا۔ ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا کھیلتے کودتے بڑے ابو کے کمرے میں ان کے آزو بازو بیٹھنے کے لئے یا بڑی امی کی گود میں بیٹھنے کے لئے

''پہلے ہم، پہلے ہم کی گردان کرتے ہوئے ہم بڑے ہوتے گئے۔''

ان کے بیانات سے مترشح ہے کہ آپا ہی نہیں رہ جاتیں اور عمر میں پانچ چھ سات سال کی بڑائی، چھوٹائی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آپا کا ماں جیسا سلوک اس رشتے کو اور گہرائی اور پیچیدگی عطا کر دیتا ہے اور چھوٹے بھائی کے دل ودماغ میں نفسیاتی گرہ ڈال دیتا ہے۔ اس کا دل گوارہ نہیں کرتا کہ اس کی شادی

آپا سے ہو۔اسکی بزدلی یا سعادت مندی بڑے ابو کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے لیکن وہ اس معاشی پہلو کو نظر انداز نہیں کر پاتا کہ بڑے ابو نہیں چاہتے کہ انکی پشتینی جاگیر میں کسی دوسرے خاندان کی شرکت ہو۔ گھر کی دولت جائداد گھر میں رہ جائے یہی بہتر ہے۔

وقت وحالات کے جبر سے شادی تو ہو گئی لیکن طرفین نے اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا۔اس کہانی کا اختتام یوں ہوتا ہے:

''پھر طلاق نامہ اور جائداد سے دست بردار ہونے کے کاغذات انکے ہاتھوں میں تھما کر کسی کو کچھ بتائے بغیر نا معلوم سمت کی طرف چل پڑا۔اس عزیز ہستی سے ناطہ توڑتیاور اپنی جائداد سے دست بردار ہوتے وقت دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے لیکن مجھے اس خاندان میں پیدا ہونے کا تاوان تو ادا کرنا ہی تھا۔''

جاگیر دارانہ نظام ،زمیندارانہ مزاج ومیلان اور حویلیوں کے کلچر والی اور بھی کہانیاں اس مجموعے میں شامل ہیں۔''ڈرامے کا ڈراپ سین'' اور'' آخری وعدہ'' کا تعلق بھی ایسی ہی کہانیوں سے ہے۔

''آخری وعدہ'' کی لاوارث حویلی میں جھونپڑی والی عورت کا بچہ معاہدے کے تحت گود لے لیا جاتا ہے۔اور سگی اولاد کی طرح پالا جاتا ہے لیکن اس پرورش میں گرم جوش محبت کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور بالآخر بڑا ہونے پر بچے کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ممی اسکی حقیقی ماں نہیں اسی لئے ان سے وہ ممتا بھرا پیار نہ مل سکا جو اس کی کھلائی سے ملا کہ وہی اس کی حقیقی ماں تھی۔لیکن اس کا کیا ہوا وعدہ یاد دلا کر اسے کہیں اور نا معلوم جگہ پر جا بسنے کا حکم دیا گیا۔

اس کہانی میں ممی اور ماں دونوں ہی زد آتی ہیں رشتوں کے درمیان

پیدا ہونے والی خلیج یہاں بھی نا قابل عبور نظر آتی ہے۔

حویلی اور نوابی شان وشوکت کے پس منظر کی کہانی ''ڈرامے کا ڈراپ سین'' بھی ہے۔نور نظر مرد اور شہوار عورت کردار ہیں۔نور نظر نے ولایت سے وکالت پاس کی ہے۔پریکٹس خوب چلتی ہے ۔اس لئے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔حویلی میں شہوار کو کسی بات کی کمی نہیں لیکن یہی فارغ البالی اور خوش حالی نہ صرف اسے تنہائی کے شدید احساس میں مبتلا کر دیتی ہے بلکہ وہ خود کو شوکیس میں سجائی ہوئی چیتھڑے کی گڑیا سمجھنے لگتی ہے کیونکہ اس کے احساسات وجذبات یا مرضی اور خواہش کا اس حویلی میں کوئی پرسان حال نہیں:

''اماں حضور نے تو مجھے قیدی بنا کر رکھ لیا ہے۔نہ میری اپنی کوئی مرضی ہے نہ کوئی زور، مجھے مائکے جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

اسی احساس قید وبند سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ اماں حضور کو زندگی کے حصار سے نکال باہر کرنے کی تدبیر کرتی ہے۔لیکن وہی تدبیر سے پُر دودھ کا گلاس بھول سے نور نظر کو چلا جاتا ہے جس کے پیتے ہی ایسی کفیت پیدا ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کو بلانے کی بھی نوبت نہیں آتی ۔اور کہرام برپا ہو جاتا ہے اماں حضور کی ایسی چیخ نکلتی ہے کہ دوسری بار چیخنے کا موقع نہیں ملتا۔یہی چیخ زندگی کی آخری ہچکی ثابت ہوتی ہے۔

خاتون محترم جناب نو شابہ کے اس مجموعے میں کل پچیس افسانے ہیں۔انکے اصل موضوعات اور مسائل میں تنوعات ہیں۔معاشرتی نظام اخلاقیات میں بھی تنوع ہے۔یہ کہانیاں عورت اور مرد دونوں قسم کے کرداروں کے مسائل پیش کرتی ہیں۔بچوں اور بوڑھوں کی نفسیات کی بھی عکاس ہیں ماضی اور حال کا معاشرہ بھی ان کہانیوں میں عکس ریز دکھائی دیتا ہے ۔اونچے

،درمیانہ،اور نچلے طبقے کی بھی کہانیاں اس میں موجود ہیں۔علاوہ ازیں اپنے وطن عزیز ہندوستان سے بسلسلہ کسب معاش نکل کر دوسرے خلیجی اور یورپی ،امریکی ملکوں میں بود وباش اختیار کر لینے والوں اخلاقیات،نفسیات اور رویوں کا فنکارانہ تجزیہ بھی کئی کہانیوں میں ملتا ہے۔ہوس زر کے مثبت اور منفی اثرات کی بھی جھلک ان کہانیوں میں ملتی ہے۔مقیمان مغرب کی عدیم الفرضی اور بے حسی کے اشارے بھی دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر اولڈ ایج ہاؤس کے حوالے سے بھی میرے مطالعے میں ایک کہانی آئی ہے جس سے معاشرتی اور اخلاقی سطح پر نفسیاتی خلیج کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔اس طرح افسانہ خلیج کے علاوہ دوسرے افسانوں میں بھی معنوی کیفیات کے لحاظ سے اسے ایک قدر مشترک قرار دیا جا سکتا ہے۔اس سے نوشابہ خاتون کی بنیادی تخلیقی فکر ورجحان کا انعکاس ہوتا ہے۔

ایک دوسری مشترک قدر بھی ہے جسے اسلوب زبان و بیان اور فنی نکات کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عصر حاضر کے فنی میلانات کے تناظر میں بعض مقامات پر تشنگی کا بھی احساس ہوتا ہے لیکن حکایات دلپذیر کا بیان از خود اس تشنگی کو بجھا دیتا ہے۔اور ایک کہانی کو دوسری کہانیوں سے کسی حد تک مربوط و مسلسل بھی رکھتا ہے۔

کرداروں کا ماحول ،معاشرہ یا منظر وپس منظر کچھ بھی ہو، ان میں عمومیت ہے۔یہ ہماری مختلف معاشرتی سطحوں کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہیں۔کوئی انقلابی اور مثالی کارنامہ انجام نہیں دیتے لیکن متعلق کہانی کے حدود میں اپنی کارگزاریاں انجام دیتے ہوئے اپنے قاری کی توجہ کا محور ومرکز بنے رہتے ہیں۔

ان کہانیوں کا عمومی میلان سنجیدہ ہے۔زبان وبیان شستہ اور شائستہ

ہے جو مکالمات کے برمحل اور برجستہ فقروں اور جملوں سے بھی ظاہر ہے۔محاوروں میں علاقائیت بھی ہے اور عمومیت بھی لیکن سب سے بڑی خوبی ان کی یہ ہے کہ عبارت آرائی کے درمیان یہ بڑے ہی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور کہانی کی فضا کو خوشگوار بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔-----

---

سراب

وہ دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر وہاں سے رخصت ہوا۔ کیا کیا سوچ کر آیا تھا، لیکن اسے کتنی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دل میں ایک خلش ایک بے چینی تھی۔ کیسے وہ اتنا طویل سفر طے کرے گا۔ ابھی تو ایک لمبی مسافت طے کرنی ہے۔ زندگی جتنی مختصر ہے اتنی ہی/طویل بھی جسے ہنس کر گزارنا جتنا آسان ہے، رو کر گزارنا اتنا ہی دشوار۔ ان دشوار راہوں میں کون ہے جو اس کا ساتھ دے گا، لیکن یہ راہ تو اس نے خود ہی اپنے لیے چنی تھی۔ شاید اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا تھا کہ جس کرب میں وہ اب تک مبتلا رہا تھا، کہیں وہ دکھ اسے ساری زندگی نہ جھیلنا پڑے۔ گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل اسے آج بھی یاد تھا۔ جب وہ پہلی بار اپنے چچا کے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا تو وہ بے حد خوش تھا۔ اس کا داخلہ اسکول میں ہوگیا اور وہ بڑے شوق سے پڑھائی میں لگ گیا تھا، لیکن یہ احساس شدید تکلیف دہ تھا کہ اسے اس گھر میں وہ رتبہ وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ پہلا جھٹکا تو پہلے ہی دن لگا تھا، لیکن وہ یہ سوچ کر سہہ گیا کہ شاید یہ اس کا وہم ہو۔ دوسرا جھٹکا تب لگا جب سودا سلف لانے کے لیے اس کے ہاتھوں میں جھولا پکڑا دیا گیا۔ البتہ تینوں وقت کا کھانا اسے پابندی سے مل جایا کرتا تھا جسے وارنڈے پر بچھے ہوئے کھرے تخت پر بیٹھ کر وہ کھالیا کرتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ یہی کیا کم ہے کہ اسے رہنے اور کھانے کا سہارا مل گیا تھا۔

حالانکہ اس وقت اس کی عمر زیادہ نہ تھی، لیکن اتنی سمجھ تو تھی ہی کہ وہ اپنے پرائے کا چہرہ پہچان سکے اور اس کی غیرت کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر ڈال دے۔ وقت گزرتا رہا اور وہ آگے بڑھتا رہا، لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا، پھر بھی اسے ایک معقول جاب مل گئی، لیکن اب تک وہ احساس کمتری کے شکنجے سے آزاد نہ ہو سکا تھا۔ کسی سے نظریں ملا کر بات کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ کسی تقریب میں شریک نہ ہوتا۔ اپنی تقدیر کے فیصلوں سے سمجھوتہ کرکے بڑی سادی سی زندگی گزار رہا تھا، لیکن جب خدا نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا اس کے یہاں بچی پیدا ہوئی تو اس کے اندر بہت ساری تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ وہ بہت خوش رہنے لگا جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ اس نے اپنی بیٹی کا نام انبساط رکھا، لیکن اس کی یہ خوشی بہت جلد ختم ہوگئی اچانک اس کی بیوی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ دکھ سارے دکھوں پر بھاری تھا۔ کسی پل اسے چین نہ آتا۔ یہ احساس ستاتا کہ وہ اپنی بیوی کو موت کے چنگل سے چھڑا نہ سکا۔ تب اس کے دل میں ایک انوکھے سے جذبے نے جنم لیا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی بیٹی کو تخت طاؤس پر بیٹھا دے جہاں وہ رانی بن کر راج کرے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمتیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں۔

دھیرے دھیرے اس کی آرزو کا یہ ننھا سا پودا تناور درخت بنتا گیا۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس نادانی پر ہنستا کہ یہ کیسا روگ پال لیا ہے اس نے؟ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ کیا اسے اس خواب کی تعبیر مل سکتی ہے؟ شاید وہ خدا کی ذات اور اس کی مہربانیوں سے مایوس ہو چکا تھا۔ جب کہ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ قدم قدم پر اپنے وجود کا

یقین دلاتا ہے۔ پکار پکار کر کہتا ہے :

"مانگ مجھ سے کیا مانگتا ہے۔"

لیکن شرط یہ ہے کہ لگن سچی ہو اور صدق دل سے مانگا جائے اور شاید اس بار اس نے صدق دل سے دعا مانگی تھی جو قبول ہوگئی۔

کسی تقریب میں انبساط کو ایک بزنس مین نے دیکھا، پسند کیا اور جھٹ پیغام بھیج دیا، وہ تو حیرت زدہ رہ گیا۔ کیا خدا مجھ پر اتنا مہربان ہو گیا کہ اتنی جلد اس کی مراد پوری کر دی بغیر پس و پیش کے۔ اس نے فوراً یہ رشتہ قبول کر لیا اور جھونپڑی کی رہنے والی محلوں کی رانی بن گئی۔

شروع شروع میں تو تقریباً ہر ماہ وہ بائی پلین آتی جاتی رہی پھر وقفہ بڑھتا گیا اور اب تو صرف فون سے ہی باتیں ہوتیں۔ جب بیٹی کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں تو ایک دن وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ جہاں اس کی پر عیش زندگی دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا وہیں دل میں ایک خلش بھی پیدا ہوگئی کہ بیٹی کے پاس اس کے لیے وقت نہ تھا وہ بہت ہی مصروف ہوگئی تھی کہ بڑے لوگوں کی ہزاروں مشغولتیں ہوتی ہیں۔

ایک دن ایک بڑے ہوٹل میں پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہوٹل جاتے وقت انبساط نے کہا: "پاپا چونکہ مجھے ہی سارا انتظام کرنا ہے اس لیے میں پہلے جا رہی ہوں، آپ تیار ہو کر وقت پر آجائیے گا۔ گاڑی اور ڈرائیور گھر پر موجود رہے گا۔"

جب تیار ہو کر وہ ہوٹل پہنچا تو اسے پارٹی جیسا کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے ریسپشن پر جا کر دریافت کیا: "پارٹی کس وقت شروع ہوگی؟"

"وہ تو شروع ہوگئی ہے اور ہال کا گیٹ بند ہو چکا ہے۔"

''مہربانی کرکے آپ خبر کروا دیجئے کہ ان کے ایک خاص مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں فون سے بات کر لیتا ہوں۔''

پھر اس نے بتایا: ''کچھ دیر انتظار کرنے کے لیے کہا ہے۔ آپ سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ جائیے اور انتظار کیجئے۔''

وہ بیٹھا رہا، انتظار کرتا رہا، لیکن جب کافی دیر ہوگئی تو اسے بہت شرمندگی اور سبکی سی محسوس ہونے لگی۔ دل چاہا، اٹھ کر چلا جائے، لیکن وقت اور حالات کے ہاتھوں انسان اتنا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی کچھ کر نہیں پاتا۔ یہی حال اس کا بھی ہوا، نہ جانے کس خیال نے اس کے قدم روک لیے۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد ہال کا دروازہ کھلا۔ سارے مہمان باہر نکل آئے۔ وہ گردن اٹھا اٹھا کر امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ شاید بیٹی داماد اپنے مہمانوں سے اس کا تعارف کروائیں، لیکن وہ گیٹ پر کھڑے اپنے مہمانوں کو رخصت کرتے رہے۔ جب سارے مہمان چلے گئے تو بیٹی اس کے پاس آئی۔

''چلئے پاپا آپ نے آنے میں بہت دیر کردی اور پارٹی شروع ہو جانے کے بعد وہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

وہ اٹھا اور اپنے نظر انداز کئے جانے کا بوجھ دل پر لیے ہوئے بڑی خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کا دل بہت ہی رنجیدہ تھا۔ گھر پہنچ کر بھی وہ جلد ہی بڈ روم میں چلا گیا، لیکن ساری رات سو نہ سکا۔ برسوں بعد ایک بار پھر احساس کمتری کے عفریت نے اسے دبوچ لیا تھا۔ صبح اٹھنے کے بعد وہ کئی بار انبساط کے بارے میں دریافت کر چکا تھا، لیکن ہر بار یہی معلوم ہوا کہ وہ سو

رہی ہے۔ دن چڑھے وہ اٹھی تو خود ہی اس کے پاس آئی۔ ''آپ جاگ گئے پاپا؟''

''ہاں میں تو کب کا اٹھ چکا ہوں اور کئی بار تمہارے بارے میں پوچھا بھی۔''

''کوئی کام تھا کیا پاپا؟''

''ہاں اب میں جانا چاہتا ہوں، میری ٹکٹ کروا دو۔''

''اتنی جلدی پاپا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں نے اس کے دل کو موم کی طرح پگھلا دیا۔ جن میں سارے گلے شکوے بہہ گئے۔ شفقت پدری سے مغلوب ہو کر اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

''اس کی شان و شوکت اور عیش و آرام دیکھ کر پاپا نے کتنا بڑا دھوکا کھایا ہوگا! دیکھنے سمجھنے اور ہونے میں کتنا تضاد ہے، کاش وہ انہیں بتا سکتی کہ بظاہر خوش نظر آنے والی ان کی بیٹی کی زندگی میں کس قدر انتشار اور بے سکونی ہے۔'' اس نے اپنی زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن اس کے چہرے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کے دل میں ایک درد سا اٹھا۔ اس کی بیٹی اس سے کتنی دور ہو گئی تھی۔

جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو اسے لگا کہ آج وہ صحیح معنوں میں تہی دست ہو گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ جیسے برسوں کے بند چشمے پھوٹ پڑے ہوں۔ ہر طرف بیٹی کی صرف پرچھائیاں تھیں ایک سراب جو اس کی دسترس سے بہت دور تھا۔

آشیاں اپنا

انہوں نے دروازے کی کنڈی میں قفل لگایا اور پھر سکھ اور دکھ کے ملے جلے جذبے کے ساتھ در و دیوار پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور سفر پر روانہ ہوگئیں۔ بچوں کا دھیان آتے ہی کانوں میں ان کی آوازیں رس گھولنے لگیں تب دل میں خوشیوں کی ہزاروں قندیلیں روشن ہوگئیں۔ ورنہ شوہر کے گزر جانے کے بعد تو جیسے ساری دنیا ہی ویران ہوگئی تھی۔ وہ مسلسل تنہائی کا عذاب جھیل رہی تھیں۔ اور اب بیٹے کے بلاوے پر وہ خوش اور مطمئن تھیں۔ سوچا تھا اپنی باقی زندگی کے ایام ان ہی لوگوں کے ساتھ گزار دیں گی۔ لیکن وہاں آنے کے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ تب بھی تنہا تھیں اور اب بھی تنہا ہیں۔ ان کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ البتہ یہ روز کا معمول تھا کہ صبح شام اشرف ان کے پاس آ کر خیریت دریافت کرلیا کرتے۔

''امی ٹھیک ہیں نا، کوئی تکلیف تو نہیں اور وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیتیں۔ یہ چند رسمی کلمات بھلا ان کی کیا دل جوئی کر سکتے تھے۔

وہ چاہتی تھیں کہ بچے ان کے پاس آ کر بیٹھیں، لیکن انہیں فرصت کہاں اب تو شعور کی پہلی منزل پر ہی ان کے شانوں پر کتابوں کا اتنا بھاری بوجھ لاد دیا جاتا ہے کہ ان کے لیے ہلنا بھی مشکل ہے۔ پھر بھی انہیں امید رہی کہ شاید کبھی وہ ان سے کہانیوں کی فرمائش کریں۔ جیسا کہ وہ اپنی دادی اماں سے جب تک ایک دو کہانیاں نہ سن لیتیں انہیں نیند نہیں آتی۔ لیکن فی زمانہ جو

مزہ ٹی وی پر کارٹوں دیکھنے میں ہے وہ دادی نانی کی کہانی میں کہاں۔
کبھی کبھی فون پر بیٹی سے کچھ باتیں ہو جایا کرتیں، اسے بھی کہاں اتنی فرصت تھی کہ گھڑی دو گھڑی اطمینان سے باتیں کرتی۔ انہیں یاد آیا پچھلے سال جب وہ وہاں گئی تھیں تو افشاں نے انہیں آرام پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی لیکن ان کی تنہائی نہ دور کر سکی۔ وہ جاب پر صبح کی گئی شام میں لوٹتی، کھڑے کھڑے حال احوال پوچھتی پھر کاموں میں جٹ جاتی۔ آتے جاتے صرف اس کی جھلکیاں ہی دکھائی دیتیں اور وہ تنہا پڑی پڑی بور ہو کر سوچتیں۔ ان لامحدود ضرورتوں اور خواہشوں نے انسان کو انسان سے کتنا دور کر دیا ہے۔ اس قدر فاصلے بڑھ گئے ہیں جنہیں طے کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ وہ بہت جلد اوب گئیں۔

"افشاں! اب مجھے واپس بھیج دو بیٹا۔"

"کیوں امی اتنا جلد گھبرا گئیں۔"

"گھبرائی نہیں ہوں بیٹا۔ ایک تو تم خود مصروف رہتی ہو اس پر میری ذمہ داری۔"

"آپ کی کیا ذمہ داری ہے امی! بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو تھوڑا وقت بھی نہ دے سکی۔"

"کیا کرو گی تمہاری بھی مجبوری ہے۔ میں پھر آؤں گی ابھی مجھے جانے دو۔"

ان کے اصرار پر افشاں کو ان کی بات ماننی پڑی۔

اور اب وہ یہاں یہ سوچ کر آئی تھیں کہ بہو سارا دن فارغ ہی رہتی ہے۔ بیٹے کو بھی ہفتہ میں دو دنوں کی چھٹی ہوتی ہے۔ بچے چار بجے اسکول سے آجاتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہی حال تھا۔ سب کی اپنی اپنی مشغولیتیں تھیں۔

''دڈا آج میں آپ کو اپنے بک کی اسٹوری سناؤں گا اور پوئٹری بھی جو میں اسکول میں یاد کرتا ہوں''۔ تبھی غزالہ کی تیز آواز آئی۔

''علی کہاں ہو تم جلدی آؤ ابھی تمہیں ٹاسک بھی بنانا ہے، بے کار باتوں میں وقت نہ ضائع کرو''۔ وہ ہڑبڑا گئیں۔

''بیٹا جا تیری ماں ناراض ہو رہی ہے۔''

اسے جاتے دیکھ کر ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور دل کے اندر دور دور تک اداسی اتر آئی۔ انہوں نے ایک آہ بھری۔ جب تنہائی کا زہر پینا ہی تھا تو اپنا وہ آشیاں کیا برا تھا جس کی ایک ایک اینٹ ان کی ملکیت تھی۔ اپنی بادشاہت اپنی حکمرانی تھی۔ سیاہ سفید کی وہ مالک تھیں وقت ان کی مٹھی میں تھا جب جیسے چاہتیں استعمال کرتیں لیکن موجودہ صورتِ حال بے سکونی میں اضافہ کر دیا تھا اور اس روز تو ان کا خون کھول گیا جب بالشت بھر کا لونڈا انہیں یوں بے بھاؤ کی سنا کر نکل گیا۔

''اماں جی! آپ ایک طرف چپ چاپ بیٹھی رہیے کاہے کو بک بک کیجئے ہے۔ غزالہ پاس ہی کھڑی تھی لیکن اس نے لب نہیں کھولے۔

''کیا میں اتنی بے وقعت، بے آسرا ہو گئی ہوں کہ اس دو ٹکے کے لونڈے کی اتنی ہمت۔ اتنی تذلیل کا سامنا تو انہیں کبھی نہیں کرنا پڑا تھا اگر وہ وقت ہوتا تو اسے دھکا دے کر ڈیوڑھی سے باہر کروا دیتیں۔ اس وقت کو یاد کرکے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب سب کچھ ان کی مٹھی میں تھا۔ رعب، دبدبہ، وقار اور اختیار لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ریت کی طرح مٹھی سے نکلا جا رہا تھا۔ اس لونڈے کی آوازوں کی بازگشت مسلسل کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ غم و غصہ کی کیفیت، بے وقعت ہونے کی

کیفیت اور احساس کو مشتعل کرنے کی تکلیف دہ کیفیت میں مبتلا تھیں۔

''کیا میں ایک ایسا بے کار پرزہ ہوں جو بے کار شئے کی طرح گھر کے کونے کھدر میں پڑا رہتا ہے۔نہیں نہیں نہیں۔کون کہتا ہے کہ میں ایک بے کار پرزہ ہوں۔مجھ میں ابھی دم خم باقی ہے۔میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ ذہن بیدار ہے۔میں کسی کی دست نگر نہیں میری حویلی ابھی قائم و دائم ہے۔

شام ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوگئیں۔ پرندے اپنے آشیاں کی طرف محو پرواز تھے۔اس منظر نے ان کے اندر عزم و حوصلہ کی ایک نئی روشنی بھر دی۔ ان کے چہرے پر طمانیت کے آثار رونما ہوگئے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور واپسی کے لیے تیزی سے اپنا سامان سمیٹنے لگیں۔

انتظار

نہ جانے کیوں تمہارے جانے کے بعد مجھے اپنی زندگی میں ایک خلاء کا احساس ہونے لگا ہے۔ حالانکہ ویسے بھی تم کون سا مجھ سے قریب تھے۔ بس ایک احساس تھا تمہارے ہونے کا ایک بھرم تھا۔ ورنہ ہم ایک ہی چھت کے نیچے اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ اجنبی تو ہم اس وقت بھی تھے۔ جب اس لفظ کے مفہوم سے ناواقف تھے۔ ہم ایک ہی آنگن میں رہ کر بھی کوسوں دور تھے۔ تم نے کبھی اپنے کھیل میں مجھے شریک نہ کیا۔ میں دور کھڑی للچائی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ چچا جان جب کبھی ادھر سے گزرتے تو کہتے: ''اسے بھی کھلاؤ بیٹا!'' لیکن تم سنی ان سنی کر دیتے۔

جب تم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اپنے چہرے پر سنجیدگی اور متانت کا مکھوٹا چڑھا لیا۔ نہ کبھی میری تکلیف پر ہمدردی کا اظہار کیا اور نہ کبھی میری کسی غلطی پر میری سرزنش کی۔ میری ذات سے یوں لاتعلق رہے جیسے اس گھر میں میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ لیکن تم مجھ سے جتنا لاتعلق تھے، مجھے اتنی ہی تمہاری فکر لگی رہتی۔ اگر ذرا بھی تمہاری طبیعت خراب ہوتی تو میرے دل میں عجیب سی بے چینی ہونے لگتی۔ کبھی جو تمہیں باہر سے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں دس بار دروازے پر جا کر کھڑی ہو جاتی۔ لاشعوری طور پر مجھے تمہارا انتظار رہتا۔ شاید اسی کو چاہت کہتے ہیں۔ لیکن اس چاہت میں تمہیں پانے کی آرزو نہ تھی۔ البتہ نہ جانے مجھے تمہاری کون سی ادا بھا گئی تھی کہ میں ایسے جیون ساتھی

کا خواب دیکھنے لگی جس کی شخصیت اور کردار میں تمہارا عکس ہو۔

میرا دل، چاہتا تمہارا ہر کام خود اپنے ہاتھوں کروں، اگر تمہاری کسی خواہش کی مجھے بھنک بھی مل جاتی تو اسے پورا کیے بغیر نہ رہتی۔

وقت کا پنچھی یونہی اڑتا رہا اور ہم اپنی عمر کے اس حصہ میں پہنچ گئے جب ہمارے بزرگوں کو ہمارے مستقبل کی فکر ہونے لگتی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے تمہارا سنجیدہ چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی خاص مسئلہ زیر بحث تھا۔ ماحول میں ایک تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ میں نے کئی بار تمہیں چچا جان کے کمرے سے غصہ کی حالت میں نکلتے دیکھا۔ شاید وہ اپنے دوست سے کیے ہوئے وعدے کو وفا کرنے کی کوشش میں لگے تھے یا سیم و زر کی چمک دمک باعث کشش بنی ہوئی تھی جس کی بلاشرکت غیرے میں مالک تھی۔ جو بھی ہو چچا جان نے نہ جانے کون سی شرط لگائی کہ ماحول ایک دم خوشگوار ہو گیا۔ تب مجھے خبر ملی، تمہارے لیے مجھے منتخب کرلیا گیا ہے۔ اس روز میں خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ میں اپنے سارے دکھ ساری محرومیاں بھول گئی جو مجھے ماں باپ کے سایہ سے محروم ہونے کی صورت میں ملی تھی۔ اب ایک روشن مستقبل میرا منتظر تھا۔ تمہارا رویہ ہنوز ویسا ہی تھا۔ لیکن میرے دل میں تمہاری چاہت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

پھر بہت ہی انتظار کے بعد آخر وہ رات آ ہی گئی جو زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ ارمانوں اور مرادوں سے بھری رات۔

میں اپنے دل میں ہزاروں ارمان لیے تمہارے سیج پر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ جان لیوا انتظار کے بعد تم آئے لیکن اس طرح جیسے کسی کلائنٹ کو وقت دے رکھا ہو۔ چند رسمی گفتگو کی اور بس۔ نہ جذبات میں ہلچل نہ انداز میں

والہانہ پن اور نہ چہرے پر کوئی خاص تاثر۔ اور میں جو تمہاری اگلی پچھلی بے رخی کا حساب لینے بیٹھی تھی تو ایک دم سے بجھ کر رہ گئی۔

پھر میں نے اکثر تمہیں کسی سوچ میں غرق دیکھا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتے دیکھا کبھی رات میں اٹھ اٹھ کر ٹہلتے دیکھا۔ میرے اندر ایک طوفان برپا تھا اور ہونٹوں پر چند سوالات۔

'تم نے ایسا کیوں کیا؟ کس بات نے تمہیں اس فیصلے پر مجبور کیا جس نے دو زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا؟ میں کب تمہاری سنگت کی خواہاں تھی۔ میں تو صرف تمہارے عکس کی شیدائی تھی اور اگر تم نے قبول کر ہی لیا تو پھر یہ اجنبیت کی دیوار کیوں حائل ہے؟ تم نے بارہا مجھ سے کہا، اگر میں چاہوں تو اس قید خانے سے رہائی پا سکتی ہوں۔ اور میں نے بارہا اس کا سبب جاننا چاہا، لیکن میرے ہونٹوں پر تو جیسے قفل پڑے رہے۔

اور پھر اچانک تم میری زندگی سے دور چلے گئے اور یکلخت سب کچھ ختم ہو گیا۔ آرزوئیں دم توڑ گئیں۔ وہ دیوار بہت ہی کمزور لگنے لگی جس کے حصار میں میں اب بھی تھی اور تمہاری رہی سہی امید یں بھی جس میں لاتعلقی کے باوجود میں پرسکون اور محفوظ تھی۔

اور اب اس چہار دیواری کے اندر بے چین روح کی طرح چکر کاٹتی رہتی ہوں۔ ذہنی انتشار کے گرداب نے مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ میری زندگی ایک مسلسل محرومی کا عذاب ہے۔ زندگی میں سوائے محرومی کے اور کچھ نہ ملا۔ نہ ماں کی محبت کی چھاؤں، نہ باپ کی شفقت اور نہ بہن بھائی کا پیار۔ ایسی بے مصرف اور لاحاصل زندگی کا کیا فائدہ جس میں دولت سے بھی میں خوشیاں نہ خرید سکی۔

یہ سوال میرے دل کو زخمی کر رہا تھا جس کی اذیت میری روح کو کرچی کرچی کر رہی تھی مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا چھایا تھا۔

میں ڈگمگاتے قدموں سے اٹھی اور خواب آور گولیوں کی پوری شیشی اپنی ہتھیلی پر انڈیل لی۔ لیکن اچانک کسی غیر مرئی طاقت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اور کانوں میں یہ آواز گونجنے لگی۔

'یہ کیا کر رہی ہو تم، کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی۔ کیا خدا کی ذات پر سے تمہارا یقین بالکل ہی اٹھ گیا؟ جانتی ہو ناامیدی کفر ہے۔

'تم اس مہربان ذات کو پکارو اور بار بار پکارو۔'

اس غیبی آواز نے مجھے حوصلہ دیا میں اٹھی وضو کیا اور دیر تک گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہی اور اب میرا دل پرسکون تھا اور پر یقین بھی کہ ایک نہ ایک دن تم لوٹ کر ضرور آؤ گے۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔

خلیج

بچی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔

''پاپا! میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پاپا میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' اس کی بس یہی ایک گردان تھی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ دل پر ایک بھاری بوجھ لیے، رومال سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے اسے خود سے جدا کرنا پڑا تھا۔ رومانہ نے بھی اپنی آنکھوں میں بے ساختہ اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا اور اسے خدا حافظ کہا۔ بچی کچھ دیر تک تو روتی رہی۔ پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ لیکن اب بھی اس کی سسکیاں بند نہیں ہوئی تھیں۔

جہاز رن وے سے اُڑ کر اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اور وہ لحہ بہ لحہ اس جگہ سے دور ہوتی جا رہی تھی جہاں اس کا محبوب تھا اور جس کے لیے اس نے اپنا تن من سب کچھ ہار دیا تھا۔ بہت ساری یادیں اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ سات سال قبل اسی ایئر پورٹ پر اس کے جہاز نے لینڈ کیا تھا۔ وہ پُر اشتیاق نظروں سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جو کبھی اس کے والدین کا وطن ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب تو اس ملک کو خیر باد کیے ہوئے بھی برسوں بیت گئے تھے۔ حالانکہ امی کو اپنے وطن سے بہت پیار تھا۔ یہاں کے ذرے ذرے سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ اسی سر زمین پر وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی تھیں۔ یہاں سارے اپنے پرائے خوشی اور غم بانٹنے والے موجود تھے۔ اب بھی جب وہ اپنے وطن کو یاد کرتی ہیں تو دل سے بے اختیار ایک آہ سی نکل جاتی ہے

اور ان کے چہرے پر حزن و ملال چھا جاتا ہے۔لیکن وہ مجبور تھیں کیونکہ ابا ایک بار جو فیصلہ کر لیتے تھے وہ اپنی جگہ اٹل ہو جاتا۔اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔اور آج عرصہ بعد اس پیاری سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے خوشی سے ان کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔امیگریشن کاؤنٹر سے گزر کر سب لوگ باہر نکلے ۔ڈرائیور انتظار میں کھڑا تھا۔ساتھ ہی ایک کزن بھی تھا جسے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی ۔لیکن ان لوگوں کی اتنی تصویریں اس کے البم میں لگی تھیں کہ اسے ان لوگوں کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ۔یہ خالہ امی کا چھوٹا بیٹا احمر تھا۔اس سے بڑے ارشد بھائی تھے جن کی شادی میں شرکت کی غرض سے وہ لوگ یہاں آئے تھے۔احمر نے نہایت خندہ پیشانی سے سبھوں کا استقبال کیا۔سلام و دعا کا تبادلہ ہوا۔پھر سب منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔سبھوں نے اپنی اپنی سیٹ سنبھالی۔ احمر ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا۔وہ وقفے وقفے سے پلٹ کر امی سے کوئی سوال کرتا اور اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتا۔گھر پر بھی سب لوگ چشم براہ تھے ۔ان لوگوں کے پہنچتے ہی ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ایک مدت کے جمع شدہ آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے ۔گھر میں شادی کی گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ روز ہی کوئی نہ کوئی رسم انجام پاتی ۔جب ماموں اور ممانی اور ان کے بچے آجاتے تو رونق اور بھی بڑھ جاتی۔اسے اس بات نے کافی متاثر کیا کہ یہاں کوئی بھی کسی پر اپنی امارت کی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ان کے رویئے میں بہت ہی خلوص، اپنا پن اور سادگی جھلکتی تھی۔ارشد بھائی تو نہایت خاموش طبع ،خود کو لیے دیئے رکھنے والے تھے لیکن احمر بہت ہی پُر مذاق ، ہنسنے ہنسانے والا زندہ دل انسان تھا۔لطیفہ گوئی اس کی ہابی تھی ۔وہ کسی کو بھی نہیں بخشتا ...... چاہے وہ خالہ جان ہوں یا ممانی جان ...... بھاوج ہوں یا بہنیں۔اس

سے تھوڑا لحاظ کرتا کیونکہ وہ ابھی اس سے کھلی نہیں تھی۔

لیکن کب تک......دل کہاں مانتا ہے۔

''ارے رومانہ! ذرا سنو بھئی!! کبھی اس غریب کو بھی تو لفٹ دیا کرو۔''

''آپ کو لفٹ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ تو خود ہی ہماری محفلوں میں گھسے رہتے ہیں۔''

''لو، اور سنو۔ یہ تو نیکی برباد اور گناہ لازم والی بات ہوگئی۔ یہ نہ کہا کہ آپ ہماری محفل کو گل گلزار بنا دیتے ہیں۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ میرا ملک تمہیں کیسا لگا؟''

''میرا نہیں، ہمارا کہیے جناب! یہ کبھی ہمارا ملک بھی تھا۔''

''تھا ناں، اب تو نہیں رہا۔ ویسے تم چاہو تو اب بھی اسے اپنا ملک بنا سکتی ہو۔''

''نہیں بھائی! میں جہاں ہوں وہیں ٹھیک ہوں۔ اور پھر میں اپنے والدین کو چھوڑ کر یہاں کیوں رہوں؟''

''والدین کو تو ایک نہ ایک دن ہر لڑکی کو چھوڑنا پڑتا ہے۔'' احمر کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''چھوڑیئے ان فضول باتوں کو۔ مجھے جانے دیجئے۔ بہت سارے کام پڑے ہیں۔'' اس نے پیچھا چھڑانے میں ہی عافیت جانی۔

اب تو اکثر جب بھی موقع ملتا احمر اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔

''ارے، کہاں بھاگی جا رہی ہو، نہ سلام نہ دعا، مجھ سے خفا ہو کیا؟''

''میں آپ سے بلا وجہ کیوں خفا ہونے لگی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ

یہاں سے سبھوں کی خوشگوار یادیں لے کر جاؤں۔ سب کے لیے اپنے دل میں نیک جذبہ رکھوں۔''

''کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ کون تمہیں کتنا یاد کرے گا؟''

''انشا ٗ اللہ ہم لوگ جلد ہی ملیں گے۔''

''انشا ٗ اللہ!'' یہ احمر کے دل کی آواز تھی۔

اسے اس بات کا تو اندازہ نہیں تھا کہ اسے کون کتنا یاد کرے گا لیکن اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ احمر کے دل میں اس کے لیے کزن سے ہٹ کر کوئی اور ہی جذبہ پرورش پا رہا تھا۔ اس بات نے اس کے پُرسکون دل میں ہلچل مچا رکھی تھی اور وہ تردد و فکر کے گرداب میں غوطے لگا رہی تھی۔ جب ان لوگوں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو ہر آنکھ نم تھی لیکن احمر بالکل خاموش تھا جیسے کوئی اہم مسئلہ حل کر رہا ہو۔ اس نے صرف ایک بار پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔

''مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟'' اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ رومانہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی۔

ان لوگوں کی پاکستان واپسی کے چند روز بعد ہی اس کے لیے احمر کا رشتہ آ گیا۔ لیکن ابو نے صاف انکار کر دیا۔

''مجھے اپنی بیٹی کو دور دیس نہیں بھیجنا ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ کھڑا ہو گا دونوں ملکوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ سامنے آ جائے گی اور ہم تڑپ تڑپ کر رہ جائیں گے۔''

لیکن جوڑے تو آسمانوں میں بنتے ہیں۔ ابو کی زبردست مخالفت کے با

وجود یہ رشتہ طے پا گیا۔ایک ماہ کے ویزا پر وہ لوگ پھر ہندوستان آئے اور یہ شادی بحسن وخوبی انجام پا گئی۔احمر کو یوں لگ رہا تھا جیسے خدا نے اسے کسی انمول تحفے سے نواز دیا ہے۔وہ بھی خوش تھی۔بیس روز یوں گزر گئے کہ پتا بھی نہ چلا۔اب صرف دس روز باقی رہ گئے تھے۔وہ اچانک بہت اداس اور خاموش ہو گئی تھی اور احمر حیرت زدہ تھا کہ اچانک اسے یہ کیا ہو گیا۔

’’تم اتنی اداس کیوں ہو رومانہ؟ کیا میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟‘‘

’’نہیں، میں اس لیے اداس ہوں کہ اب ہمارے جدا ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔‘‘

’’یہ مہمل خیال تمہارے دماغ میں کیسے آ گیا؟ اب ہمیں کون جدا کر سکتا ہے؟؟ میں نے ویزا بڑھانے کی درخواست دے دی ہے۔پھر ہملوگ ہنی مون پر چلیں گے۔بس ،اب خوش ہو جاؤ اور اس کی تیاری کرو۔‘‘

وہ بہت پُر امید تھا۔لیکن ہزار کوششوں کے باوجود ویزا نہ بڑھ سکا اور آخر کار انہیں جدا ہونا پڑا۔یہ ان کی پہلی شکست تھی۔انہیں جدا ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا......نہ اسے ہندوستان کا ویزا ملا نہ احمر کو پاکستان کا۔دونوں ملکوں کے درمیان کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔پھر جب حالات کچھ سازگار ہوئے تو اسے تین ماہ کا ویزا مل گیا۔احمر نے بلا تاخیر نکاح نامہ اور شہریت کے لیے عرضی دے دی۔تاریخ پر تاریخ پڑتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ہر تین ماہ بعد ویزا بڑھانا پڑتا۔اس تکلیف دہ صورت حال نے اس کے اندر ایک خلا پیدا کر دیا اور ہر گزرتا ہوا پل اسے یہ احساس دلا کر بے چین کر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں کچھ ایسا ہونے والا ہے جو اس کی دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔

کئی سال گزر گئے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا پھر اچانک رومانہ کو ملک چھوڑ دینے کی نوٹس آ گئی اور تین دنوں کے اندر اندر ایک بار پھر جدائی کی گھڑی آ گئی۔

جہاز اب کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ایک جھٹکے کے ساتھ یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زندان

چار سال بعد وہ وطن واپس جا رہی تھیں، بڑی مشکل سے قید و بند سے رہائی ملی تھی۔ آنکھیں بند کر کے وہ کچھ دیر کے لیے ریلیکس ہونا چاہتی تھیں، لیکن سوچوں کی یلغار انھیں چین لینے نہیں دے رہی تھی، ان چار سالوں کے واقعات ذہن میں خلفشار مچا رہے تھے۔

وقت اور حالات کی تیز رفتاری پر وہ حیران تھیں۔ عقل دنگ تھی، زمانے کی اس تبدیلی پر کہ انسان جتنی اونچائی پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے، اتنی ہی پستیوں میں اترتا جا رہا ہے۔

وہ تو ایک چھوٹے سے قصبہ کی باشندہ تھیں، لیکن تغیرات زمانہ نے انہیں وہ سب دکھا دیا جو تصور میں بھی دیکھنا نہ گوارا کرتیں۔

جب ان کے جہاز نے نیویارک ایرپورٹ پر لینڈ کیا تھا تب ان کا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ کئی سال بعد بیٹے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے گلے لگاتے ہوئے، ان کی نگاہیں بہو اور پوتے کو تلاش کر رہی تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں وقت کی قیمت کیا ہے، ایک پل کی قیمت ایک ڈالر یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ اس ڈالر کی دنیا میں قدم قدم پر بندشیں ہیں، اور ان بندشوں نے رشتوں کی اہمیت کم کر دیا ہے اور دوریاں بڑھا دی ہیں۔ جب وہ گھر پہنچیں تو وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، کہیں کوئی آواز نہیں، جیسے پورے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہو۔

بہو جاب پر گئی ہوئی تھی اور پوتا بے بی سیٹنگ میں۔ وہ اداس ہوگئیں۔ ذیشان بھی وہاں زیادہ دیر نہ رک سکا، کیونکہ اسے بھی جاب پر جانے کی جلدی تھی حالانکہ اسے افسوس تھا کہ وہ ماں کو تھوڑا وقت بھی نہ دے سکا، پر کیا کرتا وہاں تو قدم قدم پر مجبوریاں تھیں۔

''امی! فرج میں ساری چیزیں موجود ہیں کچھ کھا پی لیں اور آرام کریں۔'' وہ انہیں سمجھاتا ہوا جاب کے لیے نکل پڑا۔

وہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئیں۔ اب کیا کھانا اور کیا پینا تھا ساری بھوک مرگئی اور نیند اڑ چکی تھی۔ انہیں تو وہ دن یاد آرہا تھا جب ذیشان کا فون آیا تھا، ان کی خوشی کی انتہا نہ تھی، گرچہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی مہینہ میں دو چار بار تو اس کے فون آ ہی جاتے تھے، لیکن اس روز خلاف توقع اس نے انہیں بلانے کی بات کی تھی، حالانکہ ان چند سالوں میں کبھی انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار یا تقاضہ نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ بہت خوش تھیں شاید لاشعوری طور پر وہ ایک مدت سے اس امر کی منتظر تھیں۔ جب کوئی ان سے پوچھتا:

''سنا ہے کہ آپ امریکہ جارہی ہیں؟'

تو وہ بڑے فخر سے کہتیں:

''ہاں تم نے سچ ہی سنا ہے۔ ذیشان ویزا بھیجنے والا ہے۔ میں کہتی تھی نا کہ وہ زیادہ دنوں تک مجھ سے الگ رہ ہی نہیں سکتا ہے۔''

اب وہ ہر وقت تخیل میں خود کو بیٹے کے پاس موجود پاتیں اور پھر انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ وہ آج یہاں موجود تھیں، لیکن بیٹا آج بھی ان سے دور تھا۔ ان کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ نئی جگہ، نیا گھر اور تنہائی، انہیں وحشت سی ہو رہی تھی۔ رات گئے بہو، بچے کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی اور انہوں نے

سب کچھ بھول بھال کر بچے کو قریب کرتے ہوئے جوں ہی اسے چومنا چاہا، بہو نے روک دیا: ''نہیں امی اس طرح بچے کو پیار کرنا صحت کے لیے مضر ہے۔''

وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئیں، پھر بچے کو کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ بس دور ہی سے چمکار کر پیار کرلیتیں، انہیں یہاں آئے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تھے، لیکن ابھی تک انہوں نے بیٹے کو جی بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ صبح اس کی ایک جھلک نظر آتی اور رات میں کب لوٹتا انہیں خبر نہ ہوتی۔ چھٹی کا دن خاص کاموں کے لیے متعین رہتا۔

''ہائے یہ کیسا ترقی یافتہ ملک ہے؟ نہ کوئی چہل پہل، نہ کوئی رونق، نہ گہما گہمی، نہ کوئی آتا جاتا ہے، نہ ہی کسی کا حال احوال پوچھتا ہے۔''

اک دن تنہائی سے گھبرا کر انہوں نے بہو سے پوچھا تو جواب ملا:

''یہاں کوئی بیکار نہیں رہتا ہے امی! فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا سب اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔''

انہوں نے حیرت سے بہو کی طرف دیکھا اور بولیں:

''گویا کسی کا حال پوچھنا، خیر خیریت دریافت کرنا، وقت ضائع کرنا ہے۔ صرف کمانا کھانا، عیش کرنا ہی حاصل زندگی ہے؟ لعنت ہے ایسی ترقی پر۔''

جب وہ بہت زیادہ بور ہونے لگیں تو اپنی بوریت دور کرنے کے لیے گھر کے کاموں میں تھوڑا بہت حصہ لینا شروع کر دیا، لیکن بہو کو اپنی گرہستی میں کسی دوسرے کی دخل اندازی پسند نہ آئی۔ اس نے کسی حد تک ناگواری سے کہا

''امی آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ آپ سے کچھ ہوتا جاتا نہیں ہے۔

سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہیں۔"

وہ خاموش رہیں، لیکن دیر تک سوچتی رہیں کہ یہ وہی ہیں، جن کے سگھڑپنے کا ہر طرف چرچا تھا، لیکن وقت وقت کی بات ہے، بہو کا رخ دیکھ کر انہوں نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ سوچا وقت کا کیا ہے وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔ اس کی یہی خاصیت تو اطمینان بخش ہے اچھا ہو یا برا رکتا نہیں اور اب بہت سارا وقت گزر چکا تھا، اب وہ یہاں کے ماحول اور طور طریقے سے مانوس ہوتی جارہی تھیں کہ اچانک اس روز انہیں ایک زبردست جھٹکا لگا جب انہوں نے سنا کہ وہ بوڑھا اولڈ ایج ہوم سے فرار ہوگیا، جس کے بیٹوں نے جبراً اسے وہاں داخل کر دیا تھا، مگر پھر پلٹ کر کھوج خبر نہ لی تھی۔ ہر ویک انڈ پر بوڑھا گیٹ کی طرف رخ کر کے بیٹوں کی راہ دیکھتا رہتا کہ شاید دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی اس کا حال احوال پوچھنے کے لیے آئے، پھر ناامید ہو کر منہ لپیٹ کر سو جاتا، پھر ایک دن وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک ہفتہ بعد اس کی سڑی گلی لاش ملی۔ یہ سب جان کر ان کے دل میں عجیب سی بے چینی ہونے لگی اور وہ سوچنے لگیں، اف اس شخص کو وطن چھوڑنے کی اتنی بڑی قیمت چکانی پڑی۔ آب و ہوا کی تبدیلی نے ان کے بچوں کے خون میں اتنی سفیدی بھر دی کہ وہ اپنا فرض بھی بھول گئے۔ ہماری تہذیب آئے دن زوال پذیر ہوتی جارہی ہے۔ مادی آسائشوں نے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور صحیح و غلط کی تمیز ختم ہوتی جارہی ہے۔

ان کا دل اب وہاں سے بالکل اچاٹ ہوگیا تھا۔ انہیں اپنا وطن شدت سے یاد آنے لگا، جہاں کی تہذیب و تمدن اب بھی اپنے بزرگوں کی عزت اور احترام کا سبق دیتی ہے۔ اب وقتاً فوقتاً وہ واپس جانے کی بات کرتیں، جب

ذیشان کو یہ خبر ملی تو اسے دکھ ہوا۔

''آپ واپس کیوں جانا چاہتی ہیں امی؟ آپ کو کیا یہاں کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں کوئی تکلیف نہیں۔''

''پھر واپس جانے کے لیے کیوں پریشان ہیں؟''

''کیونکہ یہ میرا وطن نہیں، یہاں میری اپنی تہذیب نہیں۔''

''لیکن میں تو...... آپ کو گرین کارڈ دلوانے کی کوشش میں پوری طرح لگا ہوا ہوں۔''

''گرین کارڈ لے کر مجھے کیا کرنا ہے بیٹا......؟ میں تو اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے وطن میں گزارنا چاہتی ہوں۔ وہیں کی مٹی میں دفن ہونا چاہتی ہوں جہاں میرے اباواجداد دفن ہیں۔'' بے وطنی کا کرب ان کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔

ذیشان کے پاس ان کی باتوں، ان کی دلیلوں کا کوئی جواب نہ تھا، لہٰذا وہ خاموش ہو گیا اور جب ماں کا تقاضہ بڑھا تو آخر اسے ان کی واپسی کا انتظام کرنا ہی پڑا۔

ان کا جہاز اب دلی ایرپورٹ پر لینڈ کرنے والا تھا اور ان کے ذہن سے ساری یادیں محو ہو چکی تھیں۔ صرف بیٹے کی ڈبڈبائی آنکھیں نظروں کے سامنے تھیں اور بار بار کوشش کے باوجود اس کا اداس چہرہ وہ بھول نہیں پا رہی تھیں۔

زندگی جو اس طور گزری...

جب عرفان میاں نے اپنے والد کو یہ خبر دی کہ ان کے لیے لڑکی تلاش کی جائے تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تیزی سے لڑکی کی تلاش شروع ہوگئی کیونکہ وہ چالیس کے لپیٹے میں آچکے تھے۔

خدا کا شکر تھا کہ ان کی محبوبہ مس میری نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ برسوں اس کے زلف کے اسیر بنے ہوئے عرفان میاں نے جب اس سے شادی کی بات کی تو وہ چونک گئی:

''یہ آج تمہیں کیا ہوا ہے عرفان! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟''

''یہ بہکی بہکی باتیں نہیں ہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ زندگی گزارنے کے بہرحال کچھ اصول اور کچھ ضابطے ہوتے ہیں۔''

''کس اصول کی باتیں کر رہے ہو عرفان؟ اب تک کہاں کھوئے ہوئے تھے؟ چلو چھوڑو...... آؤ ابھی لائف انجوائے کرو۔''

لیکن بار بار کے اس تقاضے سے وہ گھبرا گئی اور دھیرے دھیرے ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ وہ ایک آزاد خیال لڑکی بھونرے کی مانند پھول پھول منڈلانے والی کب تک ان کا ساتھ نبھاتی۔ پھر ان کی زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں اور گئیں، لیکن کہیں کوئی فٹ نہ ہوسکی۔ ہار کر انہوں نے والد کا سہارا لیا، لیکن اب معاملہ الٹا ہو چکا تھا۔ لڑکی والوں کو یہ اعتراض ہوتا کہ لڑکے

کی عمر زیادہ ہے۔ اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ اس بات سے انہیں زبردست دھکا لگا۔ خود کے ارزاں ہونے کا افسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ پرانی ہو جانے پر ہر چیز اپنی قیمت کھو دیتی ہے۔ وقت کے زیاں کا انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا، لیکن اب سود و زیاں کا حساب لگانا بیکار تھا۔

عرفان کے والد برہان احمد برطانوی دور حکومت میں ایک اونچے عہدے پر فائز تھے۔ اس وقت ہر طرف انگریزوں کا دور دورہ تھا۔ لوگ تیزی سے انگریزی تہذیب کے زیر اثر نہ ہوئے۔ اس کے برعکس عرفان میاں انگریزی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ حالانکہ اس وقت تک انگریزوں کی حکومت کا سورج غروب ہو چکا تھا، لیکن اس کی بو باس ان کے رگ رگ میں سما چکی تھی۔ انہوں نے بھی ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ حاصل کر لیا تھا اور اب کلب پارٹی، حسین، اسمارٹ اور کسی حد تک بے باک لڑکیاں ان کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ ان کے والد ریٹائر ہو کر اپنی آبائی حویلی میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ وہ اکثر اپنے والدین سے ملنے وہاں جایا کرتے تھے۔

وہاں پر روز رات میں محفل جمتی اور گھر کے مختلف موضوع پر غور و فکر کی جاتی۔ اکثر ان کی شادی کا ذکر بھی چھڑ جاتا۔ ان کی خالہ زاد نسیمہ ایک سگھڑ، سلیقے مند لڑکی تھی۔ بہت حسین تو نہ تھی، لیکن قبول صورت ضرور تھی۔ ان کے والد نے دل ہی دل، اسے اپنے بیٹے کے لیے منتخب کیا تھا اور موقع ملتے ہی انہوں نے اس کا ذکر عرفان میاں سے کیا۔ اس غیر متوقع ذکر سے عرفان میاں کی بھویں چڑھ گئیں اور منہ ایسا بنایا جیسے کوئی بہت کڑوی کسیلی چیز منہ میں پڑ گئی ہو۔

”نہیں ابا مجھے آپس میں شادی نہیں کرنی ہے۔ کیا میرے لیے شہر میں

لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے؟''

''کوئی بات نہیں جیسی تمہاری مرضی'' برہان صاحب نے بجھے دل سے کہا۔ لڑکی کی تلاش ہنوز جاری تھی اس طرح پانچ سال اور سرک گئے، لیکن پھر وہ جو کہتے ہیں نہ کہ:

''ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔''

تو آخر ایک جگہ بات بن ہی گئی۔ لڑکی اکلوتی اور دولت مند تھی۔ باقی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالنے کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ بہت مطمئن اور خوش تھے۔ لیکن بیوی کو دیکھتے ہی ان کے سارے جذبات سرد پڑ گئے کیونکہ ان کے حسین تخیل کی کسوٹی پر وہ پوری نہ اتر سکی۔ خود بھی عمر عزیز کا ایک بہترین حصہ کھو چکے تھے، لیکن رسی جل گئی تھی پر اینٹھن باقی تھی۔

بیوی ایک ناپسندیدہ ہستی بن کر رہ گئی اور اس ناپسندیدہ ہستی کی ناپسندیدہ باتوں کی تلخیاں ہمیشہ ماحول کو مکدر کرتی رہتیں۔

کبھی ان کے لباس پر اعتراض ہوتا تو کبھی ہیئر اسٹائل پر، کبھی انداز گفتگو پر اور کبھی بدسلیقگی پر۔ آئے دن کی چخ چخ اور تو تو میں میں نے دونوں کی زندگیوں کو تلخ بنا دیا تھا۔ بیوی گھبرا کر بار بار میکے سدھارتیں۔ پھر دھیرے دھیرے وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔

تنہائی عرفان میاں کا مقدر بن چکی تھی۔ عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ وہ ریٹائر ہو کر قدرے بڑے شہر میں منتقل ہو گئے۔ زندگی بڑی بے کیف گزر رہی تھی۔ رنگ رلیوں کا وقت گزر چکا تھا، لیکن اب بھی ان کی نظروں کے سامنے مس میری کی تراشیدہ زلفیں اور دلربا ادائیں گھومتی رہتیں اور کانوں میں ہائے ہیلو کی آوازیں گونجتی رہتیں۔

وہ اس قدر چڑچڑے ہوگئے تھے کہ کوئی نوکر ایک ماہ سے زیادہ ان کے پاس نہیں ٹکتا۔ بیمار پڑتے تو کوئی ایک گلاس پانی دینے والا نہ ہوتا۔ آس پاس رہنے والے اعزہ و اقربا کبھی فون پر اور کبھی پاس جاکر حال احوال پوچھ لیا کرتے اور مشورہ دیتے کہ اب بھی بیوی کو قبول کرلیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بدقسمتی سے کوئی اولاد بھی نہ ہوئی۔ اب انہوں نے اپنی باقی زندگی اپنی آبائی حویلی میں گزارنے کو ترجیح دی حالانکہ اب وہاں نہ وہ دور دورہ تھا نہ وہ رونق۔ اس ماحول کو وہ کبھی دقیانوسی کہتے تھے، لیکن وہ تو عہد رفتہ کی باتیں تھیں۔ اس وقت کلب کی رنگینیاں اور سرسراتے آنچل کا نشہ اور خمار تھا۔

حویلی آکر ان کی تنہائیاں دو رہوگئیں کیونکہ حویلی کی دیکھ بھال کے لیے ایک پرانا ملازم رمضانی موجود تھا۔ اب حویلی پر اسی کا راج پاٹ تھا۔ پوری حویلی میں اس کے اہل و عیال پھیلے تھے۔ یہ بات عرفان میاں کے تانا شاہی مزاج کو کیسے گوارا ہوتی۔ ان کے مزاج میں تو اب بھی رعب دبدبہ باقی تھا۔ رمضانی میاں تو خیر مدتوں سے ان کے نمک خوار تھے ان کی ہاں حضوری میں لگے رہتے، لیکن ان کے بچے اس دور کے پیداوار اور مساوی حقوق کے دعویدار ، یہ رعب کیا برداشت کرتے ۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، یہاں بیٹھو ، وہاں نہ بیٹھو، رمضانی میاں کی پوتی جو آئی اے کی طالبہ تھی، اس نے ایک دن کہا:

”دادا تم ایک کرایہ کے مکان کا بندوبست کرو اب میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ ہر وقت کی مداخلت نہیں برداشت کرسکتی۔ ایک تو اس بڈھے کی کھوں کھوں سے ساری رات نیند نہیں آتی ہے دوسرے پڑھائی میں بھی خلل پڑتا ہے۔“

رمضانی میاں کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''بیٹی یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ ہم نے زندگی بھر ان کا نمک کھایا ہے۔ ان کی شان میں ایسی باتیں ہمیں زیب نہیں دیتیں۔''

اور یہ ایک اتفاق تھا کہ عرفان میاں ادھر سے گزر رہے تھے۔ وہ اپنے کانوں سے ایسی باتیں سن کر دم بخود رہ گئے۔ یہ الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھا جس نے ان کے کانوں اور دماغ کو زخمی کر دیا، لیکن وہ خاموش رہے۔ دوسرے دن رمضانی سے کہا:

''حویلی کے پیچھے والا حصہ جو خالی پڑا ہے اس کی صفائی کرا کے تم لوگ وہیں منتقل ہو جاؤ۔ مجھے زیادہ شور وغل پسند نہیں۔''

''لیکن سرکار آپ بالکل تنہا ہو جائیں گے۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو ضرورت پڑنے پر بلا لوں گا۔''

عرفان میاں کے دل میں رہ رہ کر کوئی نوکیلی چیز چبھ رہی تھی، جیسے کوئی نیزے کی انی چبھو رہا ہو۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ کھنگال ڈالا، لیکن کوئی ایک پل بھی ایسا نہ ملا جس میں انہیں ایسے اہانت آمیز الفاظ سننے کو ملے ہوں، لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں ورنہ بھرم ٹوٹ جانے کے بعد باقی ہی کیا رہتا۔

ضمیر کی عدالت

اف کتنا بھیانک خواب تھا۔ ایک شخص پٹیوں میں جکڑا ہوا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ باتیں ناقابل فہم تھیں۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی وہ آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ یہ کیسا خواب تھا جس پر حقیقت کا گمان ہو رہا تھا۔ یہ خواب میرے ذہن پر اتنا اثر انداز ہوا کہ آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ ساری رات میں نے کروٹیں بدل بدل کر گزار دی۔ بڑی مشکل سے جیسے ہی آنکھ لگی، فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ میرا خدشہ سچ ثابت ہوا، جو خبر میں نے سنی اس نے میرے ہوش وحواس اڑا دیئے۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

یہ حادثہ کب اور کیسے ہو گیا میرے بھائی؟ تم زخمی ہو کر ICU میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ یہ دردناک خبر مجھے یٰسین بھائی نے دی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ تم مجھ سے بہت شرمندہ ہو اور ہوش آنے پر بار بار مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ بالکل یہی منظر تو میں نے خواب میں دیکھا تھا، مگر مجھے امید نہ تھی کہ اس خواب کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی۔ میرے دوست تم موت و زیست کے دوراہے پر کھڑے، اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہیں معاف نہ کروں اور معاف تو میں نے تمہیں اس وقت بھی کر دیا تھا جب تم نے میری بہت ہی پیاری ہستی کو مجھ سے چھین لیا تھا جو میرے

بچپن کا خواب تھی اور جس خواب کو میں نے ان چند سالوں میں نہ جانے کتنے خوش آئند خیالوں سے سجایا تھا اور گھنٹوں اس تخیل میں ڈوبا رہتا تھا۔ خیر چھوڑو خدا کی یہی مرضی تھی۔ میں تم سے ازلی بیر کیسے رکھ سکتا ہوں۔ تم میرے صرف دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔ ہم نے ایک ہی گھر میں ایک ساتھ چلنا سیکھا، کھیلنا سیکھا، پڑھنا سیکھا، بچپن سے جوانی تک قدم سے قدم ملا کر ہم ساتھ ساتھ چلے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب اکزام میں میرا نمبر تم سے زیادہ ہوتا یا میں کوئی پوزیشن لاتا تو تم سے برداشت نہیں ہوتا تم طرح طرح کی باتیں بناتے اور الٹی سیدھی حرکتیں کرتے۔ کبھی میری کتاب پھاڑ دیتے کبھی عین اکزام کے وقت میری نوٹ بک غائب کر دیتے۔ غرض مجھے مات دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

میں اکثر محسوس کرتا کہ شاید تم میری کامیابی سے جیلس ہو، لیکن وجہ سمجھ میں نہ آتی۔ میں جتنا سوچتا اتنی ہی تلخ یادیں ذہن کے پردے پر دستک دیتیں اور بہت سارے واقعات سوچ کی سطح پر ابھر آتے۔ نومولود 'زارا' کو گود میں لینے کے لیے ہم دونوں جھگڑ پڑتے۔ اس پر اپنا حق جماتے، اسے اپنی جاگیر سمجھتے۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو کھیل کے دوران بھی اسی کے حوالے سے ہم جھگڑتے، پھر جب وہ سن بلوغ کو پہنچی، شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو تم اپنی لچھے دار باتوں کے جال میں پھنسا کر اسے مجھ سے دور کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن تم جتنا اسے مجھ سے دور کرتے اتنا ہی اس کی چاہ اور کشش میرے دل میں بڑھتی جاتی۔ وہ نازک سی معصوم لڑکی میرے ہوش وحواس پر چھا گئی۔ مجھے ایسا لگتا کہ پل پل وہ میری روح میں اترتی جا رہی ہے اور اب اسے اپنی روح سے جدا کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ اس مدعا کو لے کر ہمارے اور تمہارے بیچ

سرد جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں کس کی جیت ہوگی یہ نہ تم جانتے تھے نہ میں جانتا تھا، لیکن اس جیت کے لیے مجھے اپنا کیریئر بنانا تھا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ شروع ہی سے بہتر تھا، جب میرا ایڈمیشن انجینئرنگ میں ہوا تو پھوپھی نے میرا برائٹ فیوچر دیکھتے ہوئے مجھے ''زارا'' کے لیے منتخب کرلیا اور چٹ پٹ منگنی بھی کردی۔ یہ لمحہ میرے لیے بہت ہی انمول تھا۔ میں خود کو ان خوش نصیبوں میں شمار کرنے لگا جن کی اللہ بہت جلد سن لیتا ہے، لیکن یہ تمہاری زبردست شکست تھی۔ تم تلملا اٹھے۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگے، یہاں تک کہ زہر کھالیا، لیکن تمہاری زندگی ابھی باقی تھی۔ تمہیں دنیا میں اور بھی کارنامے انجام دینے تھے، اس لیے بچ گئے، لیکن تمہارے جسم کا خون کافی حد تک متاثر ہوا۔ تب میں نے خود کو تمہارے لیے پیش کیا۔ اب تمہارے جسم میں میرا خون گردش کر رہا تھا۔ تم اٹھ کر کھڑے ہوئے اور مجھے گلے لگا لیا۔ مجھ سے معافی مانگی اور شکریہ ادا کیا۔ کچھ دنوں تک تم نے اپنی دوستی اچھی طرح نبھائی، لیکن پھر بھی تمہارے دل میں نہ جانے کون سی گرہ تھی جو کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

پھر میں پڑھائی کے سلسلے میں پونے چلا گیا۔ تعلیمی دور کے یہ چار سال بہت ہی سرشاری میں گزرے۔ مجھے دنیا بہت ہی خوبصورت نظر آنے لگی۔ اس وقت میں انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا اور اپنی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا لیکن یہ انتظار خوش آئند لمحات میں بدلنے کے بجائے ایک روح فرسا خبر لے کر آیا۔

دل پر جو گزری سو گزری لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ اتنے دنوں بعد پھوپھی کو مجھ میں کون سی خامی نظر آ گئی، یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سارا جال تمہارا پھیلایا ہوا ہے۔ تم نے نہ جانے میرے خلاف پھوپھی کو کیا کیا

پٹی پڑھائی، زارا کو کس طرح ورغلایا کہ اس نے تمہارے نام کی انگوٹھی پہن لی۔

تم نے میری متاع زندگی کو مجھ سے اس بے دردی سے چھینا کہ میں تلملا اٹھا۔ ویسے تو تمہارے حوالے سے میرے ذہن میں کوئی خوشگوار یادیں نہ تھیں، لیکن تم اس حد تک جا سکتے ہو، ایسا میں نے نہیں سوچا تھا۔ تمہاری اس ستم ظریفی نے میرا دل ریزہ ریزہ کر دیا، لیکن اللہ کی مرضی اور نوشتہ تقدیر جان کر میں نے صبر کرلیا۔ ویسے بھی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے چند اچھی خصلتیں مجھ میں ڈالی ہیں۔ مجھے بڑوں کی یہ نصیحت یاد ہے کہ کوئی تمہارے لیے چاہے کتنا بھی برا چاہے، تم اس کے لیے کبھی برا نہ چاہنا، خواہ وہ تمہارا دشمن ہی کیوں نہ ہو اور کبھی بدلہ لینے کی کوشش نہ کرنا کہ معاف کرنے والوں کا درجہ بدلہ لینے والوں سے زیادہ بلند اور افضل ہے۔ ویسے بھی بدلہ لینے کی طاقت انسان میں کہاں ہے۔

تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا میں نے اسے بھلا دیا۔ تمہارے ہر ناروا سلوک کو نظرانداز کر دیا، تمہیں معاف کیا۔ تم اب بھی میرے وہی پیارے دوست ہو۔ تم گھبراؤ نہیں میرے بھائی میں، آ رہا ہوں۔

سحر ہونے تک

اس کی ہر رات خوابوں میں گزرتی لیکن سحر ہونے تک سارے خواب ٹوٹ کر بکھر جاتے، سارے مناظر خلط ملط ہوجاتے، کوئی سرا نہ ملتا جس سے سلسلہ جوڑا جائے ذہن کے تہہ خانے میں چھپی ہوئی دھندلی یادیں اسے ہر وقت بے چین رکھتیں۔ کوئی منظر واضح نہ ہوتا۔ وہ کون تھا اس کے ماں باپ کون تھے۔ یہ سوال وہ بار بار خود سے کرتا۔ یہاں تک کہ اسے بھی یاد نہ تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ نہ جانے کتنے دنوں تک وہ نیم خوابیدہ سی حالت میں رہا۔ جب اسے پوری طرح ہوش آیا تو اسے سب کچھ یاد آنے لگا لیکن وہاں سے ہل نہیں سکتا تھا، صبح سے شام تک کسی شاہراہ پر ہاتھوں میں پیالہ لئے صدائیں لگاتا رہتا۔

''اللہ کے نام پر دے دے بابا، بچوں کا صدقہ دے دے بابا۔

اسی طرح صدائیں لگاتے ہوئے وہ لڑکپن کی سرحدیں پار کر گیا۔ اب وہ ایک بھر پور نوجوان تھا اور اب اس کا نام پتہ ہاتھ کی صفائی اور وہ راہ زنی تھی اس کے ساتھ اور بھی کئی لڑکے تھے۔ سب ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ سردار ہفتے کی شام ان لوگوں سے حساب لیا کرتا تھا۔ جب وہ اپنے پیشے پر نظر ڈالتا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ لیکن وہ اس پیشے سے الگ نہیں ہوسکتا تھا کہ سردار اسے کسی حالت میں نہیں بخشتا۔ وہ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔

یہ گینگ ہر تھوڑے دنوں پر اپنی جگہ تبدیل کرتا رہتا تھا۔
لہٰذا ایک بار پھر وہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوگیا۔ جب ٹرین مطلوبہ جگہ پر رکی تو وہ لوگ وہاں اتر گئے۔ اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے اچانک اس کی نظر اس بڑے سے سائن بورڈ پر پڑی جس پر بڑے حروف سے اس شہر کا نام لکھا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ خوابیدہ احساسات جاگ اٹھے۔
''ہاں ہاں یہی تو ہے وہ جگہ جس کی اسے تلاش تھی اور جہاں مدت کے بعد وہ یہاں آیا ہے۔ جب وہ اسٹیشن سے باہر آیا تو سڑکیں گلیاں اور دوکانیں سب کچھ اسے مانوس سی لگ رہی تھیں حالانکہ بہت کچھ بدل گیا تھا لیکن پھر بھی اسے ایک کشش سی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنے گھر کو کیسے ڈھونڈ پائے گا۔ اپنا گھر پہچان پائے گا بھی یا نہیں۔ اب اس کا یہی کام تھا کہ سارا سارا دن سڑک سڑک گلی گلی گھومتا رہتا۔ ویسے بھی وہ اس پیشے سے منسلک تھا جس میں گھوم گھوم کر جگہ جگہ کا جائزہ لینا اور اپنی راہ ہموار کرنا ضروری تھا۔
اس لئے سردار اس سے کبھی باز پرس نہ کرتا تھا۔ گھومتے پھرتے وہ ایک ایسی جگہ آپہنچا جو اسے جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ لیکن وہ حویلی کہاں تھی ابھی جس مکان کے سامنے وہ کھڑا تھا وہاں لائن سے چند کمرے تھے جو بہت ہی خستہ حال دکھائی دے رہے تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے اس نے دریافت کیا:
''بھائی صاحب آپ کو معلوم ہے، یہاں پر کہیں پہلے ایک حویلی تھی؟''
''یہی تو ہے وہ حویلی۔''
''اس حویلی میں ایک بزرگ رہتے تھے؟''
''کہیں آپ لیاقت علی صاحب کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے

ہیں‘‘

’’ہاں ہاں وہی‘‘

’’وہ تو کب کے گزر چکے۔‘‘

’’اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا لیکن اس نے کمال ہوشیاری سے اپنے تاثر چھپا لئے۔

بچپن میں ان کا ایک بیٹا گم ہوگیا تھا، کہیں آپ وہی تو نہیں؟‘‘

’’نہیں نہیں ان سے میرے دور کے مراسم تھے۔‘‘

وہ خوف زدہ تھا کہ اگر حقیقت کھل گئی تو اس کا جینا حرام ہوجائے گا۔

’’لیاقت علی صاحب کو خدا اپنے جوار رحمت میں جگہ دے وہ بڑے نیک، خدا ترس اور سوجھ بوجھ والے انسان تھے۔ غریبوں کی مدد کرتے رہتے تھے لیکن ان کا بیٹا بالکل ان کے برعکس نکلا۔‘‘ اس نے برا سا منہ بنایا۔ ’’ساری چیزوں کو تتر بتر کردیا۔ اب تو اس کا گزر بسر ہونا مشکل ہے۔‘‘

اس کا دل چاہا اس گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر خوب روئے۔ اسے خاموش دیکھ کر وہ شخص پھر گویا ہوا۔

اس گھر کے مکینوں سے آپ کو ملنا ہے؟‘‘

’’نہیں پھر کبھی اور۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنا رُخ پھیر لیا کہ کہیں اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو سارا راز ہی نہ فاش کردے وہ اندر سے بہت ہی بے چین تھا اس کی یادداشت میں اماں کی تو کوئی شبیہ نہ تھی لیکن ابا کی شفقت یاد آرہی تھی۔ پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے بھیا بہت ہی سر چڑھے تھے۔ من مانی کرنا، ہر ایک پر رعب جمانا ان کی عادت بن گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی ان کی زیادتی کا شکار ہوجاتا تھا اور وہ معصوم سی بھولی بھالی

لڑکی آج تک اس کے ذہن سے محو نہ ہو سکی ہے۔ وہ اب بھی اس کے خوابوں میں آتی ہے۔

ایک دن اُس لڑکی کی طرفداری کرنے کے سلسلہ میں بھیا نے اس کی اتنی پٹائی کی کہ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سارا دن مارا مارا پھرا بس یہیں تک اُسے یاد ہے۔ پھر اُسے کچھ ہوش نہ رہا۔ اور زندگی کی ستم ظریفی اسے کہاں سے کہاں لے آئی۔

کئی دنوں بعد ایک بار پھر وہ اس حویلی تک آ پہنچا۔ آنے جانے والوں کی نظروں سے بچتا ہوا اس نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ ایک ملازمہ قسم کی عورت نے دروازہ کھولا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' ملازمہ نے بہت مہذب طریقے سے اس سے سوال کیا۔

''امجد علی صاحب گھر پر ہیں۔''

''جی وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

''اور کوئی ہے؟''

''جی ان کی دونوں بیویاں ہیں۔''

''ان سے جا کر کہو ان کے کوئی عزیز ان سے ملنے آئے ہیں۔''

ملازمہ دوبارہ آئی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا ڈرائنگ روم کیا تھا بس چند پرانی کرسیاں تھیں اور ایک تخت جس پر سفید چادر بچھی تھی جو سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھی۔

کچھ دیر بعد پردہ ہٹا کر ایک عورت اندر داخل ہوئی جسے دیکھ کر اُسے جھٹکا لگا لیکن ذہن پر زور ڈالنے کے بعد بھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت

کو اس نے کہاں اور کب دیکھا تھا۔

''شاید آپ مجھے پہچان نہیں رہے ہیں مگر جانتے ضرور ہوں گے۔ میں آسفہ ہوں۔''

''آسفہ؟ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنا بدل گئی تھی وہ وقت اور حالات انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

آپ اپنا تعارف ہمیں کرائینگے؟''

''جان کر کیا کرو گی۔ سمجھ لو ایک مسافر ہوں۔''

''مسافر تو ہر انسان ہی ہے لیکن کوئی نام کوئی اتہ پتہ تو ہوگا مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ شاید آپ گوہر علی ہیں۔ جس کی جدائی میں ابا نے رو رو کر جان دے دی''

یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں چھلک آئیں اور اسے ایسا لگا جیسے دل کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔

امجد علی کی اہلیہ سے نہیں ملواؤ گی؟''

''وہ معذور ہیں چل پھر نہیں سکتیں۔''

''اور دوسری؟''

''دوسری آپ کے سامنے موجود ہے۔''

''کیا بھیا نے تم سے شادی کر لی، مگر کیوں۔

''یہ نہ پوچھئے انہوں نے اپنا راستہ تو اسی وقت صاف کر لیا تھا جب آپ کو مار بھگایا تھا۔''

''تم نے کوئی احتجاج نہ کیا؟''

''آپ اب تک ویسے ہی معصوم ہیں'' اس کے چہرے پر بڑی تکلیف

وہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا کوئی قیدی قید خانے میں رہ کر زبان کھول سکتا ہے۔ اور اب اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

اچانک وہ واپسی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے چائے تو پی لو۔''

لیکن اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ سحر ہونے تک اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

معاهدہ

تو آخر وہی بات ہوئی جس کا اُسے ڈر تھا۔ ایک پل میں سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے۔ سارے عشق، سارے جنون ہوا ہوگئے۔ یہ ذات ہی بے اعتبار ہے۔ نہ اس کی محبت میں پائداری ہے، نہ وفا میں خلوص، عورت اس کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔ جب تک جی چاہا کھیلا، جب دل بھر گیا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔

لیکن وہ اتنی کمزور کم ہمت نہیں ہے جو ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ خدا نے اسے عقل سمجھ، طاقت اور ہمت عطا کی ہے۔ وہ جینے کی راہ نکال ہی لے گی۔ مانا کہ مرد کی رفاقت عورت کے لئے ایک پرکیف اور دل پذیر شئے ہے لیکن رفاقت جب قباحت میں بدل جائے تو اس کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔

وہ دیر سے جلے ہوئے زخم پر پھاہا رکھنے کی کوشش کررہی تھی لیکن جلن اتنی شدید تھی کہ کم ہی نہیں ہورہی تھی۔ احساسِ شکست رہ رہ کر اس جلن میں اضافہ کررہا تھا۔ ہاں اس کی پیشانی پر یہ بدنما داغ اس کی انا کی شکست اور توہین ہی تو تھی۔

بچپن سے لے کر اب تک کی ایک ایک بات اسے یاد آرہی تھی۔ شارق شروع سے ہی شدت پسند تھے۔ جب کوئی چیز انہیں پسند آجاتی تو اسے حاصل کرکے ہی دم لیتے۔ اور جب دل بھر جاتا تو حقارت سے اسے پھینک دیتے۔ ان کی چاہت میں جتنی شدت تھی اتنی ہی ان کی نفرت میں بھی۔ ان کی

اس کیفیت کو وہ بخوبی جانتی تھی کیونکہ وہ دونوں بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہے اور پلے بڑھے تھے۔

شارق کی اُس پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ اکثر وہ اپنی بائک گیٹ پر روک کر اُسے آواز دیتے۔

''شرمین آؤ میں تمہیں کالج پہنچا دیتا ہوں۔''

''نہیں شارق بھائی مجھے اپنی عادت نہیں خراب کرنی ہے۔ میں بس سے آرام سے چلی جاتی ہوں۔ آپ کو کیوں تکلیف دوں۔''

وہ شارق سے ساتھ بڑھانا نہیں چاہتی تھی

جب کبھی وہ بہت موڈ میں رہتے تو کہتے ''آؤ شرمین ہم پکے دوست بن جاتے ہیں۔''

''یہ نظرِ عنایت مجھ پر ہی کیوں؟''

''کیونکہ تم میری سب کزنس سے زیادہ قابل اعتماد ہو۔''

''لیکن مجھے آپ پر بھروسہ نہیں۔'' شرمین نے دوٹوک کہا۔

''لیکن کیوں؟'' ''کیونکہ آپ کی کبھی تولہ کبھی ماشہ والی فطرت مجھے خوف زدہ کرتی ہے۔''

شارق نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اور ان کا بلند و بالا قہقہہ فضا میں گونج گیا۔ اکثر کزنس اُسے چھیڑتیں ''آجکل شارق بھائی تم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہے ہیں۔ آخر معاملہ کیا ہے؟''

''یہ تم انہیں سے پوچھ لینا۔'' اس نے خفگی سے کہا۔ اسے شارق پر غصہ آرہا تھا خواہ مخواہ اسے بدنام کرکے رکھ دیا ہے۔

خدا کا شکر تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلے گئے اور اس نے سکون

کی سانس لی۔ لیکن تعلیم پوری کر کے جب لوٹے تو بطور لائف پارٹنر اسے ہی منتخب کیا۔ امی ابا اس پروپوزل سے بہت خوش تھے۔ بھلا کیوں خوش نہ ہوتے، شاید یہ ان کی دیرینہ آرزو رہی ہو۔ ویسے بھی شارق کی شخصیت میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ وہ خوش اخلاق تھے اور خوش گفتار بھی۔ ہاں کچھ موڈی ضرور تھے لیکن یہ خامی کسی کو ریجکٹ کرنے کا جواز نہیں بن سکتی تھی۔ لہٰذا بہت جلد وہ دونوں عقد کے پاکیزہ بندھن میں بندھ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت میں بہت خوش تھے سرشار تھے ایک دن کی جدائی بھی انہیں برداشت نہ تھی۔ ایک ماہ کے بعد ہنی مون سے لوٹے تھے کہیں ابھی خمار باقی تھا۔ یہ ایک ایسا نشہ تھا جس کے حصار سے اب تک وہ باہر نہیں آئے تھے۔

''شارق آپ کی اس جنونی محبت سے مجھے بہت خوف آتا ہے۔'' ایک دن اس نے اپنے ڈر کا اظہار کر ہی دیا۔

''کیسا خوف؟''

''اگر خدانخواستہ آپ کی محبت میں ذرا بھی کمی آئی تو میں سہہ نہ سکوں گی۔'' ''ایسا کبھی نہ ہوگا۔''، ''پکا وعدہ؟''، ''ہاں تم دیکھ لینا۔'' شارق نے محبت کے جذبے سے مغلوب ہوکر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

لیکن یہ وعدہ وفا نہ ہوسکا۔

ان دونوں کے بیچ پہلی دراڑ تب پڑی جب اس نے شارق کو بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ لیکن ان کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہ دیکھ کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا اس خبر سے آپ کو کوئی خوشی نہ ہوئی؟''، ''نہیں''، ''کیوں؟''، ''کیونکہ یہ میری محبت کی تقسیم ہے۔''

''آپ کا خیال غلط ہے۔ یہ ہماری محبت کی تقسیم نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کے درمیان ایک مستحکم پل'' اس نے پُر یقین لہجہ میں کہا۔

''تم کہتی ہو تو چلو میں مان لیتا ہوں۔ لیکن ہمیں ابھی اس پل کی کیا ضرورت ہے۔''

پھر شارق نے وہی کیا جو ان کی خواہش تھی۔

یہ پہلی گرہ تھی جو شارق کی طرف سے اس کے دل میں پڑ گئی تھی۔ اور پھر تناؤ بڑھتا گیا۔ بات بات پر شارق کا موڈ خراب ہو جاتا۔ کبھی کبھی غصہ میں وہ ساری حدیں پھلانگ جاتے۔

وہ سہم جاتی زندگی اجیرن بنتی جا رہی تھی۔ وہ سوچتی ایسا کب تک چلے گا ابھی تو شروعات ہے۔ ابھی تو پوری زندگی پڑی ہے۔ لیکن آناً فاناً وہ سب ہو گیا جس کی اسے توقع نہ تھی۔ طلاق کے تین لفظ بول کر شارق نے اسے اپنی زندگی سے باہر کر دیا۔

اس سانحہ نے اسے مرد کی ذات سے متنفر کر دیا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اب کبھی اپنی زندگی میں کسی مرد کو داخل ہونے نہ دے گی۔ گویا اس نے اپنے دل کے دروازے پر ''نو انٹری'' کا بورڈ لگا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر پیچھے نہ دیکھا۔ گویا پتھر کی بن گئی۔ ادھر ماں باپ غم کی تصویر بنے تھے۔ انہیں بیٹی کی اجاڑ صورت نہ دیکھی جا رہی تھی۔ وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو پھر سے بیٹی کا گھر آباد کر دیں۔ اسی فکر میں دو سال کا عرصہ گزر گیا پھر اچانک ایک رشتہ آ گیا جو ہر طرح سے مناسب تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی والدین کے مجبور کرنے سے ان کی خوشنودی کے لئے اسے اپنا عہد توڑنا پڑا۔

ساجد ٹھنڈے دماغ کا ایک خاموش طبع لڑکا تھا۔ اس کی محبت میں جوار بھاٹا والا ابال نہ تھا۔ زندگی سبک رفتاری سے گزر رہی تھی۔ لیکن وہ اکثر شارق کا ذکر چھیڑ دیتا جس سے اسے بہت ہی کوفت ہوتی۔

''کیا آپ کے پاس کوئی اور موضوع نہیں ہے؟ وہ تنگ آکر کہتی۔''

''کیا اس ذکر سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے؟''

''ہاں اب ہم دونوں کے درمیان ان کا ذکر کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔

''لیکن وہ تو اب بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، تمہارے لئے دیوانہ ہے۔ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا ہے۔''

''اتنے قریب سے آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟''، ''وہ میرا دوست ہے۔''

''اوہ تب ہی تو ان کی اتنی طرفداری کر رہے ہیں۔''

''میں طرفداری نہیں کر رہا ہوں۔ واقعی وہ ایک اچھا انسان ہے۔''

''ہاں تب ہی تو وہ کام کر بیٹھے جو خدا کی نظروں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے اور جس پر دنیا تھوکتی ہے۔''

''تمہارا قصور بھی تو رہا ہوگا؟'' ساجد نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ تو انہوں نے بھی مجھے ہی موردالزام ٹھہرایا۔

کئی دنوں تک وہ بالکل گم سم رہی۔ ساجد بھی کسی سوچ میں گم تھا۔ اسے اپنا معاہدہ ٹوٹتا نظر آرہا تھا اس قرض کا کیا ہوگا جو اس نے اس معاہدہ کے عوض لیا ہے۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' شرمین نے اپنی خاموشی توڑ دی۔

"یہ دیکھ رہا ہوں بلکہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان سی ہو۔ شاید میرے ساتھ رہ کر تم خوش نہیں، خوش بھی کیسے ہو سکتی ہو، تمہیں دینے کے لئے تمہیں خوش رکھنے کے لئے میرے پاس ہے ہی کیا۔ وہ سب جو شارق نے تمہیں دیا تھا یا دے سکتا ہے۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ تم اب بھی اسے اپنالو۔ میں تمہیں خوشی سے آزاد کر سکتا ہوں اور تم شوق سے اس کا ہاتھ تھام سکتی ہو۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟ اس نے بے یقینی سے ساجد کی طرف دیکھا۔

"نہیں میں بالکل سیریس ہوں، میں تم دونوں کا بھلا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے وعدہ بھی کیا ہے۔ ۔" "کیا؟ شرمین کا سر گھوم گیا۔

"یہ کیا بکواس ہے۔ آپ مجھے بیشک آزاد کر سکتے ہیں کیونکہ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ لیکن میں کوئی لباس، کوئی فرنیچر، یا کوئی مکان نہیں ہوں کہ لوگ مجھے بدلتے رہیں جیسے میں کوئی بے جان شئے ہوں۔

ساجد کئی دنوں تک شرمین کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر کسی خاص نتیجے پر پہنچ کر ایک فیصلہ کر لیا۔

جب اس نے شارق سے کہا۔ "میں شرمین کو طلاق نہیں دے سکتا۔" تو اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم نے مجھ سے دغا کیا" مجھے دھوکا دیا۔ اس غداری کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔"

"دغا میں نے آپ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کیا تھا کیونکہ میں نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا میں آپ کا ہی نہیں خدا کا گنہگار ہوں۔ میں ہر سزا بھگتنے

کے لئے تیار ہوں لیکن اسے چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور شاید وہ بھی مجھ سے۔ شارق کچھ دیر خاموش رہا پھر ایک آہ بھر کر سوچا جو محبت، یقین اور اعتماد میں برسوں میں حاصل نہ کر سکا وہ ساجد نے چند ماہ میں حاصل کر لیا۔ آخر کیوں کیسے؟''

چناؤ کا موسم

چناؤ کا موسم آتا ہے اور ہر بار اپنے ساتھ بہت ساری بربادیاں لاتا ہے۔ اس کے جھگڑا اتنے تیز وتند ہوتے ہیں کہ کتنے گھروں کو تباہ کر ڈالتے ہیں، کتنی ماؤں کی کوکھ اجڑ جاتی ہے۔ کتنی مانگوں کے سیندور مٹ جاتے ہیں، خبریں آتی رہتی ہیں۔ لیکن معاشرے کی بے حسی کا یہ عالم کہ لوگ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔ کسی کے دل میں درد نہیں جاگتا، کوئی اس بے راہ روی پر قابو پانے کے لئے آگے نہیں آتا۔ کیونکہ انسانیت مر چکی ہے ہر بار یہی کہانی دہرائی جاتی ہے۔

نیتا جی اپنی کرسی بچانے یا حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کسی کی لاش پر سے گزرنے میں کوئی عار نہیں، کوئی شرمندگی، کوئی افسوس نہیں کیونکہ کرسی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ جو چیز ایمانداری اور جائز طریقے سے حاصل نہیں ہو تو اسے چھین جھپٹ کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ برا بھلا، جائز ناجائز، گناہ ثواب سب بے معنی باتیں ہیں۔ اصل پوجا پاور اور پیسہ کی ہے۔

اس کی پوجا کرتے رہو جیون سپھل ہو جائے گا۔

کئی دنوں سے دردناک خبریں آ رہی تھیں۔

آج سے پانچ سال قبل ایسی ہی ایک خبر نے شیام داس جی کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ ان کی خوشیوں، ان کی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا تھا وہ

خوشی جو انہیں بہت ہی مشکل، بہت ہی منت مرادوں سے حاصل ہوئی تھی برسوں ان کا آنگن سونا پڑا رہا تھا۔ کہیں کوئی ہل چل کوئی کلکاریاں نہیں بیوی کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو تیرتے رہتے تھے۔ اس کا بس ایک ہی تقاضہ تھا۔ لیکن یہ کوئی بازار میں بکنے والی چیز نہ تھی کہ خرید کر کسی کی گود میں ڈال دی جاتی۔ ہ خود بھی اس آواز کو سننے کے لئے ترس رہے تھے کہ کوئی ان کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنی توتلی زبان سے پیاری پیاری باتیں کرے۔ دن رات گزرتے جارہے تھے اور وہ بالکل ہی نا امید ہو چکے تھے کہ اچانک اوپر والے نے ان پر ترس کھا کر یہ دولت ان کی جھولی میں ڈال دی۔ ان کی زندگی کا مقصد پورا ہوگیا۔ جینے کا حوصلہ مل گیا، گھر کی رونقیں بڑھ گئیں۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ں بکھر گئیں۔

یہ خوشی اور طمانیت بھرے دن کیسے گزر گئے پتہ ہی نہ چلا کہ کب بنٹی اسکول سے کالج پہنچ گیا۔ وہ اب ایک بھرپور نوجوان بن چکا تھا۔ بہت ہی بولڈ بہت ہی ایکٹو۔ کالج کے اندر باہر ہر معاملہ میں پیش پیش۔ پولیٹکس میں اس کی دل چسپی دیکھ کر شیام جی کو تشویش لاحق ہونے لگی۔

انہوں نے اب تک کی زندگی بڑے ہی سکون سے گزاری تھی۔ وہ آسان اور سہل زندگی کے قائل تھے لہٰذا انہوں نے بنٹی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم میں جوان خون جوش مار رہا تھا وہ اپنے ملک کو آئڈیل ملک دیکھنا اور بنانا چاہتا تھا۔ اس کا کچا ذہن اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ کوئی ملک بھی اس وقت تک ایک آئڈیل ملک نہیں بن سکتا جب تک اس کے اندر سے چوری، بے ایمانی، جھوٹ فریب، خود غرضی اور نا اتفاقی کا خاتمہ نہ ہوجائے۔ لیکن یہ جراثیم تو بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ اس کی جڑیں امرلتہ کی لت

کی طرح پھیلتی ہی جارہی ہیں۔ اور اسے اکھاڑ پھینکنا کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

ایک بار پھر چناؤ کے موسم نے زور پکڑ لیا تھا۔ ہر طرف بھاشن کا بازار گرم تھا۔ اس کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ بنٹی بھی سرگرم عمل تھا۔ سارا سارا دن غائب رہتا۔

شیام داس جی کی پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

''بنٹی تو آج کل سارا سارا دن کہاں رہتا ہے؟''

ایک دن انہوں نے بنٹی کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھ بیٹا اس کلجگ میں صحیح اور سچے انسان بہت کم ہی ہیں۔ گویا کھانے میں نمک کے برابر۔ سب اپنے اپنے مفاد کے پجاری ہیں۔ بھاشن کے نام پر چارہ ڈالتے ہیں۔ معصوم اور کچے ذہن کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ جو تو دن رات مندر اور مسجد کی باتیں سنتا ہے یہ سب ایک خطرناک ہتھیار کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کی مار بہت ہی کاری ہوتی ہے۔ جو گاہے گاہے استعمال ہوتا رہتا ہے سچ پوچھو تو اصل مندر اور مسجد انسان کے اپنے من کے اندر ہے جسے نہ کوئی چرا سکتا ہے اور نہ توڑ سکتا ہے۔''

لیکن بنٹی پر باپ کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا دل جوش و ولولہ اور کچھ کر دکھانے کے عزم سے پُر تھا۔

بالآخر چناؤ کا دن آگیا۔ صبح سے ووٹ ڈالنے کا کارج کرم چل رہا تھا۔ سارے امیدوار آرام سے اپنے اپنے گھروں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

شیام داس جی بھی اپنے گھر میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ دفعتاً

ایک بریکنگ نیوز نے ان کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔

خبر کے مطابق جس بوتھ پر بنٹی تعنیات تھا وہاں دو پارٹیوں میں جھڑپ ہوگئی تھی۔ معاملہ نے طول پکڑ لیا۔ حالات پر قابو پانے کے لئے پولس کو فائرنگ کرنی پڑی۔ فائرنگ میں دس گھائل ہوئے اور دو کی موت ہوگئی۔ مرنے والوں میں ایک کا نام رمیش اور دوسرے کا بنٹی تھا۔ شیام داس جی نے کلیجہ تھام کر جو آنکھیں بند کیں تو ہفتوں نہیں کھولیں لیکن سخت جان تھے کہ انہیں موت نہ آئی۔

اور برسوں بعد اب بھی جب وہ ایسی خبریں سنتے ہیں تو ان کا دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ پورے وجود میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ اور لب پر یہ دعا ہوتی ہے۔

''ہے بھگوان جلد ہی کوئی ایسا مسیحا پیدا کر جو مردہ انسانیت کو پھر سے زندہ کردے۔

آخری وعدہ

جب بھی میں اس جھونپڑی کے سامنے سے گزرتا، میرے قدم رک جاتے نہ جانے اس عورت کے چہرے میں کیا بات تھی کہ دل خود بخود اس طرف کھنچا چلا جاتا۔ کوئی انجانی سی طاقت مجھے اس راستے سے ہوکر گزرنے پر مجبور کردیتی۔

ابھی کچھ روز قبل ہی پاپا کا ٹرانسفر اس شہر میں ہوا تھا۔ ایک دن چہل قدمی کرتا ہوا میں اس جگہ پہنچ گیا۔ وہ جھونپڑی کے باہر کھڑی تھی جیسے کسی کا انتظار کررہی ہو۔ لیکن کس کا؟ اس نے تو بعد میں مجھے بتایا تھا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ اس جھوپڑی میں تنہا رہتی ہے۔ اس کی صورت میں بلا کی جاذبیت تھی جسے آنکھوں کی اداسی نے دوبالا کردیا تھا۔ صحرا جیسی ویران آنکھیں جیسے صدیوں سے کسی کی متلاشی ہوں میں بلا ناغہ اس راہ سے گزرتا کبھی چند لمحے رکتا اور کبھی کچھ دیر جھوپڑی کے سامنے برگد کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ جاتا۔

ایک دن اس نے پوچھا۔

''اس چبوترے پر بیٹھ کر تم کس کا انتظار کرتے ہو۔ تمہیں کس کی تلاش ہے؟

''ہاں''

''کس کی؟''

''ممتا کی''

''تمہارے ماں باپ؟''

''ہیں''

''پھر؟''

پھر — اس سے آگے میرے پاس کوئی واضح جواب نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ زندگی میں مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ میرے اشارے پر ہر وہ چیز حاضر ہوجاتی جس کی مجھے خواہش اور ضرورت ہوتی۔ لیکن انسان کی خواہشیں اور تمنائیں یہیں تک محدود نہیں ہوتیں۔ مجھے سب کچھ میسر تھا لیکن پھر بھی میرا حال اس بدبخت شخص کی مانند تھا جس کی جھولی تو بھری ہوئی ہوتی ہے لیکن دل ویران اور روح پیاسی ہوتی ہے۔ اور اسے اس چیز کی تلاش ہوتی ہے جو اس کی روح کو سیراب کردے۔

عہد گذشتہ کی ایک تلخ یاد اس کے ذہن کے پردے پر ابھری۔

رات ہی سے طبیعت کچھ مضمحل تھی۔ صبح ناشتہ کے ٹیبل پر بیٹھا ضرور تھا۔ لیکن نہ کچھ کھانے کی خواہش ہو رہی تھی اور نہ اسکول جانے کی ہمت۔ میں نے ذرا ڈرتے جھجکتے کہا۔

''پاپا آج میں اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں؟ چھوٹی چھوٹی وجہ بتا کر تم اسکول نہ جانے کا عذر پیش کردیتے ہو۔ دیکھ رہا ہوں پڑھنے میں تمہارا دل نہیں لگ رہا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ بن کر دکھاؤ۔

میں بادل نخواستہ پاپا کے حکم کی تعمیل کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شام میں جب اسکول سے واپس آیا تو بخار میں تپ رہا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا سوائے

رحیم چاچا کے مجھ پر انہوں نے رحم کیا۔ میرے کپڑے تبدیل کروائے مجھ سے کھانے کے لئے پوچھا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا میں ممی پاپا کے انتظار میں بار بار دروازہ کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ پھر بخار کی شدت نے مجھے بدحواس کر دیا۔ نہ جانے کیا وقت تھا۔ میں نے نیم غنودگی کی حالت میں آنکھیں کھولیں تو وہ دونوں میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دودھ کے ساتھ دوا کھلائی۔ جس سے قدرے افاقہ ہوا۔ پھر وہ رحیم چاچا کو کچھ ہدائتیں دے کر کسی پارٹی میں چلے گئے۔ اور میں نے پوری رات تکلیف کی حالت میں سوتے جاگتے گزاری اس روز پہلی بار میرے دل کی ایک کرچی ٹوٹ گئی۔

بے شمار یادوں میں سے ایک اور یاد ذہن کے پردے پر ابھری کئی دنوں سے میرے گھر میں بڑی گہما گہمی تھی بڑی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے سٹ بدلے جا رہے تھے۔ نئ نئ کراکریز خریدی جا رہی تھیں۔ بڈ روم میں خوش نما خوش رنگ بڈ شیٹ بچھائے جا رہے تھے۔ میں نے اس اہتمام کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لندن والی خالہ جان کل آ رہی ہیں۔ دوسرے دن پاپا وغیرہ انہیں رسیو کرنے کے لئے جب اسٹیشن جانے لگے تو میں نے بھی جانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن پاپا نے کہا۔ ''تمہارا اسکول جانا زیادہ ضروری ہے۔'' اور میں دل مسوس کر رہ گیا۔ اسکول سے واپسی پر میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں تین مہمان آئے ہوئے تھے۔ ایک خالہ جان دوسرے ان کے شوہر اور ایک ان کا بیٹا جو لگ بھگ میری ہی عمر کا ہوگا۔ میں ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ جب ہم دونوں مل کر کھیلیں گے تو کتنا مزہ آئے گا۔ لیکن وہ لڑکا بڑا ہی شرارتی تھا۔ کبھی میرا ہاتھ مڑوڑ دیتا کبھی لنگی لگا دیتا اور کبھی پیچھے سے آ کر ایک تگڑا سا دھول جما دیتا۔ جب میں نے پاپا سے شکایت کی تو انہوں نے

کہا۔ ''بچہ ہے اور ہمارا مہمان بھی۔ لڑائی جھگڑا نہ کرو مل جل کر کھیلو۔''

''پاپا لڑائی میں کہاں کرتا سارا قصور تو اسی کا رہتا ہے۔'' لیکن پاپا نے میری باتوں پر کچھ دھیان نہ دیا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ پیچھے سے آکر اس نے مجھے ایسا دھکا دیا کہ جھونکے میں وہ خود بھی اوندھے منہ گر پڑا۔ اب اتفاق یہ تھا کہ مجھے تو کچھ نہ ہوا، اس کے ہونٹ کٹ گئے اور اس سے خون بہنے لگا۔ جب یہ خبر ممی تک پہنچی تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر رسید کر دیا۔ اپنی صفائی میں مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

اس روز میرے دل کی ایک کرچی اور ٹوٹ گئی۔ جس کی چبھن نے مجھے بے تاب کر دیا۔ اپنے سینے کی اس چبھن سے میری پڑھائی متاثر ہوئی۔ نتیجتاً میٹرک میں میرا رزلٹ بہت ہی خراب آیا۔ اس روز تو حد ہی ہوگئی ممی پاپا نے اپنا سارا غصہ مجھ پر بری طرح اتارا۔ پیسہ ضائع ہونے کا رونا رویا۔ میرے جذبات کی انہیں ذرا بھی پروا نہ تھی۔ میں ان کے چہرے پر بے لوث محبت کی پرچھائیاں تلاش کرتا رہا۔ اکثر میرے دل میں یہ تمنا جاگتی اور کبھی تو یہ خلش ناقابل برداشت ہوجاتی کہ کوئی مجھ سے میری خاموشی اور اداسی کا سبب پوچھے۔ احساس محرومی جب دل پر ضربیں لگاتا تو سارے رشتے ناطے بیکار اور بے معنی لگنے لگتے اور میں اپنی اس محرومی کا سبب جاننے کے لئے بے چین ہو اٹھتا۔ یہ سوال میں اپنے آپ سے کر کر کے تھک چکا تھا۔ سینے کی چبھن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ آوارہ گردی میری عادت بن چکی تھی۔ اور اب میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ اس جھوپڑی میں گزارتا۔ نہ جانے وہاں کیسا سکون کیسا نشہ تھا جس میں ڈوب کر میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی تنہائیوں اور محرومیوں کو بھول جاتا۔ یہ کیسا والہانہ عشق تھا جس نے

مجھے اتنا بیخود کردیا تھا کہ مجھے اور کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

میری سوچ اس جھوپڑی کے ارد گرد چکر کاٹتی رہتی اور ذہن طرح طرح کے تانے بانے میں الجھا رہتا۔ بالآخر میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ اور جب میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک ٹک خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک میرے ساتھ چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس روز میں بہت خوش تھا۔ مجھے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا تھا۔ میں نے دور ہی سے پکار کر کہا۔

"ممی دیکھئے جس کے بارے میں میں نے آپ کو بتایا تھا آج اسے اپنے شامل لے کر آیا ہوں۔"

انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا، ان کی نگاہوں میں کچھ عجیب سا تاثر تھا میں ان کی اس کیفیت سے کوئی مطلب اخذ نہ کرسکا۔ اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ شاید ممی کو یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ میں ابھی کافی دیر تک کمرے سے نکلنے والا نہیں ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی میں کسی کام سے اس طرف آرہا تھا کہ اچانک ان دونوں کی گفتگو کا تھوڑا حصہ سن کر ٹھٹھک گیا۔ ممی کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو تمہارا بوبی سے اس طرح میل جول بڑھانا اور ہمارے گھر آنا جانا مناسب نہیں ہے۔ کیا تم اپنا وعدہ بھول گئیں؟

تم ہی سوچو جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ یکا یک بلندی سے پستی میں نہ گر جائے گا؟

ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ تم جلد سے جلد یہ شہر چھوڑ دو۔"

''جی بیگم صاحب! میں اپنا وعدہ بالکل نہیں بھولی ہوں۔ میرا ببو جو اب آپ کا بوبی ہے وہ ہمیشہ آپ کا بوبی ہی رہے گا۔

یہ تو میری اپنی قسمت ہے کہ میرا شوہر موت کے منہ سے نہ بچ سکا۔ ورنہ علاج میں تو آپ لوگوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بچہ کسی پریشانی اور الجھن میں گھر جائے۔

اس کی بھلائی اور ترقی کے لئے میں اپنی ہزاروں خوشیاں قربان کردوں گی۔ بہت جلد اس کی زندگی سے دور چلی جاؤں گی۔ یہ میرا آپ سے آخری وعدہ ہے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہ سن سکا۔ میرا دماغ شائیں شائیں کرہا تھا۔ جسم و جان میں طاقت باقی نہ تھی۔ گرتے گرتے بچا اور دوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

تو یہ تھا میری محرومی کا راز۔

مجھے نوکروں کے حوالے کرکے ان لوگوں کا آدھی آدھی رات تک فنکشن پارٹیوں میں رنگ رلیاں منانا۔ مجھے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر تفریح کے لئے نکل جانا۔ انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں۔ میں سارا سارا دن کہاں رہتا ہوں کس سے ملتا ہوں کب لوٹتا ہوں۔ اس کی کسے فکر تھی۔ انہیں تو صرف ایک جانشیں چاہیے۔

''اف۔ یہ بڑے لوگ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی انا کو تسکین دیتے ہیں۔ احساس کمتری سے چھٹکارا پاتے ہیں۔

میں بہت دیر تک یادوں کے بھنور میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح دیر تک سوتا رہا۔ پھر اٹھ کر تیار ہوا اور جھوپڑی کی طرف

چل دیا۔ لیکن جھوپڑی خالی پڑی تھی۔ ٹین کا بکس اور پھٹا پرانا بکس جو اس کا کل اثاثہ تھا وہ بھی غائب تھا جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اس نے یہ جھوپڑی چھوڑ دی۔

میں سکتہ کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ گم شدہ متاع ایک بار پھر گم ہو چکی تھی۔

تم نے اپنا وعدہ نبھانے میں بہت عجلت کی ماں!

کچھ کہنے سننے کا موقع تو دیا ہوتا۔ کاش یہ سوچا ہوتا کہ تمہارا یہ آخری وعدہ مجھے محرومیوں کے کسی دلدل میں ڈھکیل دے گا۔

میں بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا جہاں رحیم چاچا میرا انتظار کر رہے تھے۔

ڈرامے کا ڈراپ سین

ڈرامے کا ڈراپ سین بہت ہی حسرتناک اور حیرت انگیز تھا قدرت کے اس عجیب وغریب انتقام پر عقل حیران تھی یقین نہیں آرہا تھا لیکن یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا کہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے تھے۔ اماں حضور کے حلق سے ایک چیخ کے بعد دوسری چیخ نہ نکل سکی۔ ایسا تو اس وقت بھی نہ ہوا تھا جب ابا حضور نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا۔

کسی تنازعہ والی زمین کے تصفیہ کے سلسلہ میں وہ صبح سویرے ہی گھر سے نکلے تھے اور اب شام ہونے کو آئی تھی لیکن اب تک ان کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ بہت ہی انتظار کے بعد ان کے بجائے ان کی لاش پہنچی۔ یہ منظر دیکھ کر پوری حویلی میں کہرام مچ گیا۔ لیکن اماں حضور کے حلق سے نہ تو کوئی آواز نکلی اور نہ ہی آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو ہی ٹپکا۔ وہ پتھر کی بت کی طرح ساکت ہوگئیں۔ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہر کوئی ان کی اس کیفیت سے فکر مند تھا کہ ابھی تو انہیں بہت کچھ سنبھالنا ہے۔ بہت ساری خوشیاں دیکھنی ہیں۔

بہو نے جب حویلی کی دہلیز کے اندر قدم رکھا تو اماں حضور کے دل میں ہزاروں قندیلیں روشن ہوگئی تھیں۔ بہت ہی جتن سے وہ چاند سی دلہن ڈھونڈ کر لائی تھیں۔ نورِ نظر میاں تو ایک ہی نظر میں مر مٹے۔ اماں حضور کی پسند کو سراہا اور دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ایسے غرقاب ہوئے کہ کتنے دنوں تک بھنور سے نکلنے کا راستہ ہی نہ مل سکا۔ دلہن شوہر کا پیار اور ساس سسُر

کی شفقت اور محبت پا کر پھولے نہ سما رہی تھی۔ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ حویلی کی شان و شوکت اور امارت دیکھ کر اسے لگتا کہ جیسے وہ بس محل کی رانی بن گئی ہو۔

لیکن بہت جلد یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اس ماحول سے اوب گئی۔ اسے ایسا لگتا کہ جیسے وہ ایک چیتھڑے کی گڑیا ہے جسے شوکیس میں سجادیا گیا ہے نہ اس کی اپنی کوئی مرضی ہے اور نہ ہی وہ اس کا اظہار کرسکتی ہے۔

وہ چپ چاپ سی رہنے لگی ۔ اس کی اس کیفیت کو نور نظر اکثر محسوس کرتے اور حتی الامکان اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

''شہوار مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے پارہا ہوں۔ میں سارا دن کورٹ میں رہتا ہوں اور تم تنہا بور ہوتی رہتی ہو لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہوسکے گا میں تمہاری تنہائی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے پیار سے شہوار کا ہاتھ تھام لیا۔

پریکٹس کرنا اس کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس کا شوق تھا جس ڈگری کو اس نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اسے ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے تو اسے یاد نہیں کہ ابا حضور نے کبھی اس کی کسی خواہش کو رد کیا ہو لیکن اس سلسلے میں اسے بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ وہ بضد تھا کہ حصول تعلیم کے لئے اسے لندن جانا ہے۔ لیکن انہیں کسی طور بھی اسے نظروں سے دور کرنا گوارہ نہ تھا لیکن آخر کار اس کی خوشی کے لئے انہیں ہار ماننی پڑی۔

اجازت ملتے ہی وہ خوشی سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹ گیا۔

''تھینکو ابا حضور! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ جلد ہی اعلیٰ ڈگری لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا'' طائر وقت کی پرواز جاری رہی۔

ماہ و سال گزرتے رہے۔ پتہ بھی نہ چلا اور وہ وکالت کی ڈگری لے کر واپس آ گیا۔ ''کہاں کھو گئے؟'' شہوار نے بہت آہستگی اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ آں؟''

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں واقعی اس تنہائی اور بیکاری سے بور ہو گئی ہوں'' ''تم کیا چاہتی ہو میں پریکٹس چھوڑ دوں؟'' ''ایسا میں نے کب کہا؟'' ''پھر''

''پھر یہ کہ مجھے لفظوں کے بھول بھلیاں میں نہ الجھائیں۔'' ''میرے جذبے کو تم الفاظ کا نام دے رہی ہو؟'' ''صرف جذبوں کے سہارے وقت نہیں گزرتا میرے حضور۔'' وقت گزارنے کے لئے مجھے کوئی مشغلہ چاہئے۔''

''جو مشغلہ تمہیں پسند ہے اسی سے دل بہلاؤ۔''

''میں چاہتی ہوں کہ حویلی کی باگ ڈور سنبھال لوں۔ اماں حضور بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ اب انہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

وہ بحر حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیا شوق ہے؟'' پھر سنبھل کر بولا ''اتنی جلدی تم یہ دردسری مول لینا کیوں چاہتی ہو۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔'' اس نے شہوار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اماں حضور اتنی آسانی سے اپنی بادشاہت سے دست بردار ہونے والی نہیں ہیں اور نہ ایک نیام میں دو تلوار رہ سکتی ہے۔ شہوار خاموش ہو گئی لیکن اس کی پیشانی پر کئی سلوٹیں ابھر آئیں۔

کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پلنگ پر گم صم بیٹھی ہوئی شہوار کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر

لڑھک گئے۔ ''چلو بارش ہوگئی طوفان کا زور ٹوٹ گیا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟
اس نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر بھی وہ خاموش رہی۔

''ناراض ہو گیا؟''

''ناراض کیوں نہ ہوں۔ اماں حضور نے تو مجھے قیدی بنا کر رکھ لیا ہے۔ نہ میری اپنی کوئی مرضی ہے نہ کوئی زور مجھے مائکے جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

''تو وہ کیا غلط کرتی ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر نے تمہیں مکمل آرام کرنے کی تاکید کی ہے۔''

اسے شہوار کی نادانی پر غصہ آرہا تھا۔ شہوار نے آگے کوئی بحث نہ کی لیکن اس کی پیشانی کی سلوٹیں اور گہری ہوگئیں۔ کچھ دن ایسے ہی گزر گئے۔
جب یہ حادثہ ہوا تو بظاہر شہوار اماں کے غم میں برابر کی شریک رہی لیکن اندر ہی اندر وہ بہت خوش تھی۔

''خدا خدا کر کے بڈھی کا زور ٹوٹا اب پوری حویلی پر میرا راج ہوگا بس چابھی ہاتھ میں آنے کی دیر ہے۔ وہ چشم تصور سے دیکھتی کہ پوری حویلی پر اس کی حکومت ہے۔ خادمائیں اس کے حکم کی تکمیل کے لئے ایک اشارے کی منتظر ہیں۔ لیکن اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ کہ بیٹے کی محبت شوہر کی جدائی کے زخم کو مندمل کرنے میں معاون ثابت ہوئی انہیں ٹوٹنے اور بکھرنے نہ دیا۔ اس کا نام زندگی ہے۔ چاہے کتنا ہی بڑا حادثہ نہ ہوجائے۔ عزیز سے عزیز ہستی داغِ مفارقت نہ دے جائے۔ لیکن تمنائیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ دنیا کی محبت کبھی نہیں مرتی۔ وہ بھی دھیرے دھیرے زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ اور آخر ایک دن اپنے تخت پر آکر بیٹھ گئیں۔ چند ملازمائیں ان کے ارد گرد جمع ہوکر

خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ عین اسی وقت شہوار اپنے کمرے سے نکلی یہ منظر دیکھتے ہی جیسے اس پر بجلی گر گئی اور اس کی امیدوں، آرزوؤں اور خواہشوں کا جہان جل کر خاک ہوگیا۔ اس کی بھرتی ہوئی آرزوئیں پانی بن کر آنکھوں سے بہنے لگیں۔ پھر وہ بالکل گم صم ہوگئی جیسے اندر لاوا پک رہا ہو اور جلد ہی آتش فشاں پھٹنے والا ہو۔ نور میاں اس کی اس کیفیت سے بہت ہی فکر مند تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی نفسیاتی مرض ہو، ابھی وہ کسی سائکٹرسٹ سے رجوع کرنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اچانک ہوا میں ایک خوشگوار تبدیلی آگئی۔ وہ بہت خوش رہنے لگی اکثر اماں کے پاس جا کر کہتی۔

''اماں حضور! اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو بتایئے۔''

''اتنی اتاولی کیوں ہو رہی ہو میری بچی میرے بعد تو سب کچھ تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔''

کبھی کبھی وہ باورچی خانہ میں جا کر نوکرانیوں سے گپ لڑاتی۔ ان کے کام میں مدد کرنے کی کوشش کرتی۔

''بنفشہ بوا آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''نہیں دلہن بیگم کئی روز سے بخار آرہا ہے۔''

''ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''کہاں اتنا پیسہ ہے۔ اکیلی جان چھ چھ بچوں کا خرچ چلانا آسان ہے کیا موا نکما بیٹھ کر کھانے والا ہے۔'' شہوار نے کچھ پیسے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''لو یہ پیسے رکھ لو کل ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا اگر اور پیسے کی بھی

ضرورت ہوگی تو مانگ لینا۔ اور جاؤ اب آرام کرو میں تمہارا باقی کام کردیتی ہوں۔"

"ارے نہیں دلہن بیگم یہ کام آپ کا نہیں ہے۔ اگر اماں حضور کو خبر ہوجائے گی تو غضب ہوجائے گا۔"

"ارے کچھ نہیں ہوگا اس نے زبردستی بوا کو تخت پر لٹادیا۔

"خدا تمہارا سہاگ قائم رکھے" بوا نے صدق دل سے دعا دی۔ پھر آنکھیں بند کرلیں۔ شہوار جھٹ پٹ اس کا کام نپٹانے لگی۔ آخر میں اس نے اماں کے لئے دودھ گرم کیا پھر گلاس میں ڈالا اس میں کچھ ملایا پھر تیزی سے اپنے کمرے میں جاکر سوتی بنی۔

نوکر جب نور میاں کے لئے دودھ لینے آیا تو غلطی سے وہی گلاس لے کر چلا گیا...... دودھ پیتے ہی نور میاں کی طبیعت بگڑنے لگی۔ پوری حویلی میں اندر باہر کھلبلی مچ گئی۔ گھر کے سب افراد وہاں جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر آنے کی نوبت نہ آئی۔ نور میاں اللہ کو پیارے ہوگئے اور اماں حضور کے حلق سے ایک چیخ کے بعد دوسری چیخ نہ نکل سکی۔

یہ عشق نہیں آساں

یار راشد! ایسا لگتا ہے، جیسے مجھے عشق ہو گیا ہے۔
ہائیں! یہ مرض تم نے کب سے پال لیا ہے؟ کون ہے وہ؟''
''ہے ایک لڑکی۔''
''تم اسے کتنا جانتے ہو؟''
''کچھ زیادہ نہیں لیکن۔''
''یہ کس چکر میں پڑ گئے میرے یار! یہ عشق نہیں آساں، اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔''
''یہ تو ٹھیک ہے لیکن اِس شعر پر بھی ذرا غور کرو''

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب	جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

راشد تو کچھ دیر بعد چلا گیا اور مجھے سوچوں کی وادی میں بھٹکتا چھوڑ گیا۔ میں دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔
میں نے بھی کب ایسا چاہا تھا۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ وہ سرِ راہ ٹکرا گئی۔ ہوا یہ کہ اچانک وہ میری گاڑی کے سامنے آ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی اور کھڑکی سے باہر سر نکال کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اور بھی قریب آ گئی۔
''پلیز مجھے لفٹ دے دیجئے۔ اچانک پیٹ میں درد اٹھ گیا ہے اور پاس میں کوئی سواری بھی نہیں مِل رہی ہے۔''

چند لمحے میں اس کے چہرے کے تاثر کو پڑھتا رہا، پھر بغیر کوئی سوال کئے گیٹ کھول دیا اور وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

قدرے وقفے کے بعد میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ درد کی شدت کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ پھر وقفے وقفے سے کئی بار میں نے پلٹ پلٹ اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ کہیں تو میں آپ کو ہاسپٹل لے چلوں؟ میں نے ازراہ ہمدردی کہا۔

''نہیں نہیں آپ مہربانی کر کے مجھے میرے گھر تک پہنچادیں ورنہ امی پریشان ہوجائیں گی۔''

میں نے لڑکی کا نام، پتہ دریافت کیا اور اسے اسکے گھر کے پاس ڈراپ کردیا۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی لیکن اپنے وجود کی ایک خوشگوار مہک چھوڑ گئی۔ میں بہت ہی محویت اور پر شوق نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی ہلچل کوئی ہیجان خیزی نہ تھی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد میرا سکون چھن گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خلفشار برپا تھا۔

اس لڑکی کا نام زیبی تھا اور زیبی نے میری نیند اڑادی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اس سے قبل میں نے کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھا ہی نہ تھا۔ ایسے مواقع اکثر آئے تھے۔ لیکن میری زندگی میں کوئی ہلچل بپا نہ ہوئی تھی۔ اور اب اسے دیکھتے ہی ایسا لگا تھا کہ وہی میری منزل ہے۔

کچھ دن تو میں بولایا بولایا رہا اور پھر جہاں چاہ وہاں راہ کے مصداق، ڈھونڈتے ہوئے میں زیبی تک پہنچ گیا۔ اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

دھیرے دھیرے زیبی نے میرے متعلق پوری واقفیت حاصل کر لی لیکن میں نے اس کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کرنے کی نہ تو کوشش کی اور نہ ضرورت ہی محسوس کی۔

میں کہیں جانے کے لئے تیار کھڑا تھا، تبھی راشد آ دھمکا۔

''یہ سواری کہاں جا رہی ہے؟'' اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''تمہاری ہی طرف یہ سواری نکلنے والی تھی۔''

''کیوں بہلاوا دیتے ہو میرے یار۔ تمہاری سج دھج تو کچھ اور ہی بتا رہی ہے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ ان دنوں تمہارے بہت عیش ہیں۔''

میں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''ٹھیک ہے جی بھر کر عیش کرو لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ یہ اکیسویں صدی ہے میرے بھائی۔ لیلا مجنوں کا زمانہ لد گیا۔ اب ہر شعبہ میں سودے بازیاں ہیں ہر چیز نفع اور نقصان کے ترازو میں تولی جاتی ہے۔''

اس نے اپنی باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی آتا مجھے لکچر دینے سے بعض نہ آتا۔

اس روز میں بہت ہی موڈ میں کار ڈرائیو کر رہا تھا کیونکہ زیبی میرے بازو میں بیٹھی تھی۔ میں گاہے گاہے پلٹ پلٹ کر دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ لیتا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے شرما کر پوچھا۔

''اپنی ملکۂ حسن کو دیکھ رہا ہوں۔''

اس وقت زیبی کے چہرے پر جیسے قوس قزح پھیل گئی۔

میں نے گاڑی اپنی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر کھڑی کردی۔
دیکھو! زیبی یہی میرا غریب خانہ ہے۔''
زیبی مبہوت سی گھر کی طرف دیکھتی رہی۔
''کہو کیسا لگا میرا گھر؟ میں نے فخر سے اس کی طرف دیکھا۔
''ایسا گھر ہم نے نہ تو خواب میں دیکھا تھا اور نہ کبھی ایسے گھر کا تصور ہی کیا تھا اس کے چہرے سے خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔
ابھی اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے امید نہیں ہے کہ ابو اتنی آسانی سے رضامند ہو جائینگے۔
انہوں نے پہلے ہی میرے لئے چچا کی بیٹی کو منتخب کرلیا ہے۔''
زیبی ایک دم بجھ سی گئی۔ شاید کچھ دیر قبل جو محل اس نے اپنے خیال میں کھڑا کیا تھا وہ پل بھر میں مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا۔
کہتے ہیں،، عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، تو یہ خبر بھی گھومتی پھرتی امی تک پہنچ گئی، جسے سنتے ہی وہ سکتہ میں آگئیں۔ انہیں مجھ سے اس فعل کی قطعی امید نہ تھی۔ اب وہ مجھ پر کڑی نظر رکھنے لگی تھیں۔ جب میں کہیں جانے کے لئے تیار ہوتا تو مجھ سے دسوں سوال کرتیں۔ کہاں جارہے ہو؟ کون سا کام ہے؟ کب واپس آؤ گے؟ وغیرہ وغیرہ۔
اس روز میں بہت مشکل سے زیبی کے لئے تھوڑا وقت نکال سکا تھا۔
زیبی مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔
''راستہ بھول گئے تھے یا قید کر لیے گئے تھے؟''
تم نے ٹھیک ہی سمجھا، میں والدین کی فرماں برداری کی قید میں تھا۔''
''ایسا کب تک چلتا رہے گا؟ جس راستے پر قدم رکھا ہے اس سے گزر

کر منزل تک پہنچنے کی کوشش کرو۔'' اس کے تیور بڑے سخت تھے۔

''کوشش ہی تو کر رہا ہوں لیکن ابھی راستہ ہموار نہیں ہے۔ وقت کا انتظار کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آخر کب تک؟ اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔''

''تمہاری مرضی۔'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زیبی کی باتوں نے مجھے بہت ہی ہرٹ کیا تھا۔ آج ہی نہیں اب وہ بار بار مجھ پر پریشر ڈال رہی تھی۔ میرے قدم خود بخود راشد کے گھر کی طرف اٹھ گئے کہ وہی میرا ول ویشر تھا۔

''یہاں اچانک تمہاری سواری میرے گھر پر؟'' راشد نے مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''آج ہر کوئی مجھ سے یہی سوال کر رہا ہے۔'' میں نے اپنی ذہنی کیفیت کو اپنی مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کی۔

''کیا بات ہے یار! کچھ پریشان سے دکھ رہے ہو؟''

''ہاں تمہارا اندازہ صحیح ہے، میں واقعی پریشان ہوں۔ بات یہ ہے کہ زیبی بار بار شادی کے لئے تقاضہ کر رہی ہے۔ جب کہ میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ابو اور امی کو اعتماد میں لے لوں گا پھر کھل کر ان سے اس موضوع پر بات کروں گا۔ لیکن اب بار بار اس کے تقاضے سے پریشان ہو گیا ہوں سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں''

''تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی تو عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ تمہاری امی کہہ رہی تھیں کہ شاید اس بات کی بھنک تمہارے ابو کو بھی مل گئی ہے وہ بہت ہی مشتعل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم نے ان کی خواہش کے خلاف کوئی قدم

اٹھایا تو وہ تمہیں عاق کردیں گے۔"
عاق کا لفظ سنتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ لیکن میں نے خود کو بہت جلد سنبھال لیا۔ مجھے اپنے دوست سہیل کی یاد آگئی۔ اس کے والد نے صرف دھمکی ہی نہیں دی بلکہ واقعی عاق کردیا تھا، لیکن اس کی محبوبہ نے اسے ٹوٹنے سے بچالیا۔ دونوں نے مل کر معاشرے میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ اس بات نے اسے حوصلہ دیا اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ زیبی کے پاس پہنچا اور اپنا مدعا بیان کیا، لیکن اس کے چہرے پر کوئی مثبت تاثر نہ ابھرا۔ کچھ دیر بعد اس نے بہت ہی سرد مہری سے کہا۔

"کہنا آسان ہے اور کرنا بہت مشکل۔ اور پھر ہم اپنا حق کیوں چھوڑیں۔"

میں مایوس ہوکر واپس آگیا، لیکن میں اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا تھا چنانچہ بار بار گیا لیکن ہر بار اس کے رویہ سے مایوس ہوکر لوٹا۔ میں بہت ہی دل برداشتہ تھا۔ کئی دنوں سے شیو نہیں کیا تھا، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کئی راتیں جاگنے کی وجہ سے آنکھیں لال تھیں، کپڑے ملگجے اور بال بے ترتیب تھے۔ اسی حال میں مَیں زیبی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"زیبی میں بہت پریشان ہوں مجھے سہارا دو۔ ابو کسی قیمت پر اس شادی کے لئے رضامند نہیں ہیں۔ اب یہی ایک صورت ہے کہ ہم دونوں چھپ کر عقد کرلیں۔ میں نے شدت جذبات سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ لیکن وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگ گئی جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں کچھ دیر اس کا منتظر رہا پھر شکست خوردہ قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ دوسرے دن

زیبی کا ایک رقعہ ملا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بغیر پیسے، بغیر عیش و آرام کے تمہارے ساتھ سڑکوں پر دھکے کھاتی پھروں گی۔

''نہ بابا نا میں ایسے خالی خولی عشق کی قائل نہیں ہوں''

خط میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ دل میں ایک درد سا اٹھا۔ راشد کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ اور کانوں میں اس کی باتیں گونجنے لگیں۔

نمو خالہ

ایک شام پورے محلّہ میں کہرام مچ گیا کہ ٹنو غائب ہے۔ سب لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے لیکن کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔

ٹنو ایک سلجھا ہوا لڑکا تھا لیکن کچھ دنوں سے اس پر ایک عجیب سی وحشت طاری تھی۔ رات دن وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا رہتا تھا۔ نہ جانے کس کس سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ پھر اچانک ایک دن غائب ہوگیا۔ نہ معلوم کس نے کس مقصد کے لئے اسے استعمال کیا۔ ماں باپ ہاتھ ملتے رہ گئے تب مجھے خالہ کی نصیحتیں یاد آنے لگیں۔

نمو خالہ اکثر گھومتی گھامتی ہمارے گھر آدھمکتیں۔ یوں تو وہ ہماری امی کی خالہ ہیں لیکن ہم سب بھی انہیں خالہ ہی کہتے ہیں۔ اور ہم ہی کیا وہ تو سارے محلے والوں کی خالہ ہیں۔ وہ جب آتیں دو چار نصیحتیں ضرور کر جاتیں۔ انہیں ٹی وی سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ جہاں میں تھوڑی فرصت پا کر ٹی وی کا ریموٹ اٹھاتی بس وہ شروع ہوجاتیں۔ اچھی خاصی لمبی چوڑی تقریریں جھاڑ دیتیں۔

ارے بیٹی کیوں اپنی آنکھوں کی دشمن بنی ہے۔ دیکھتی نہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی آنکھوں پر چشمہ اسی ٹی وی کی وجہ چڑھ گیا ہے نہ جانے کس کمبخت نے بے حیائی کا پٹارہ ایجاد کیا ہے۔ جب دیکھو چھوکرے چھوکریاں کمر لچکا کر تھرکتے رہتے ہیں۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک کر کہا۔

''خالہ آپ تو کہتی ہیں میں ٹی وی نہیں دیکھتی تو پھر سب کیسے دیکھ لیتی ہیں؟''ارے بیٹی! میں نے آنکھوں پر پٹی تھوڑے ہی باندھ رکھی ہے، چلتے پھرتے نظر آہی جاتا ہے۔ میں تو لاحول پڑھ کر منہ پھیر لیتی ہوں۔ خدا غارت کرے ان بے شرموں کو۔''

''ہے ہے خالہ وہ بھی کسی کے لال ہیں انہیں کیوں کوس رہی ہیں۔

''دل جلتا ہے بیٹی! دیکھتی نہیں! ان ہی سب وجہوں سے آپس کی محبت ختم ہوتی جارہی ہے۔ پاس پڑوس میں اگر کوئی حادثہ ہوجائے تو لوگ چشم پوشی کرلیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس دوسروں کے لئے وقت ہی کہاں بچتا ہے۔ اگر کوئی مہمان آجائے تو سب کے چہرے اتر جاتے ہیں۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے بچے تو بچے بڑے بھی دیر تک پڑے سوتے رہتے ہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ ایک تو صبح کی نماز قضا ہوجاتی ہے دوسرے رحمت کے فرشتے بند دروازہ دیکھ کر لعنت بھیجتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔''

''خالہ فرشتوں کو دروازے سے آنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے مسکرا کر کہا۔''اب واللہ عالم یہ کوئی محاورہ ہے یا حدیث میں ان پڑھ کیا جانوں۔ ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ دیر تک سونے کے بہت سار نقصانات ہیں۔ سب سے بڑھکر صحت متاثر ہوتی ہے۔''

خالہ تھیں تو ان پڑھ لیکن ان کی زبان بہت ہی شستہ تھی۔

تھوڑے وقفے کے بعد خالہ پھر شروع ہوگئیں۔

''یہ جو خون خرابہ،، اغوا اور طرح طرح کی برائیاں معاشرے میں پھیلتی جارہی ہیں وہ اسی کی دین ہے۔ روز بروز ہمارا تحفظ خطرے میں پڑتا جارہا

ہے۔'' میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا یہ خیال غلط ہے خالہ! ہر چینل پر فحش، عریاں اور لغو پروگرام ہی نہیں آتے بلکہ کئی چینلز ایسے بھی ہیں جن پر اسلامی، مذہبی اور معلوماتی پروگرام بھی آتے رہتے ہیں۔ ہم گھر بیٹھے ان چینلز کے ذریعے دنیا بھر کی معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔

''لیکن بیٹی! بچے تو بہت جلد برے اثرات ہی قبول کر لیتے ہیں نا۔ اب یہی دیکھو نا! موا یہ جو کرکٹ کا کھیل شروع ہوا ہے تو بچے اس میں ایسے غرق ہوئے ہیں کہ انہیں آس پاس کی بھی کوئی خبر نہیں ہوتی۔''

''خالہ آپ تو چھپی رستم ہیں چپکے چپکے سب کچھ دیکھتی ہیں اور ہمیں بے وقوف بناتی ہیں۔''

''ارے نہیں بیٹی وہ تو کسی ضرورت سے بچوں کو آواز دیتی ہوئی وہاں تک پہنچ جاتی ہوں۔ لیکن وہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے، جھنجھلا کر کہتے ہیں'' آپ تو عین وقت پر ہی پہنچ جاتی ہیں۔ میچ کتنا انٹرسٹنگ ہو گیا ہے کتنا مزہ آرہا ہے''

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''ہے کیا زمانہ آگیا ہے؟ بچے اس قدر بے ادب ہو گئے ہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ اپنے بڑوں کے سامنے آنکھ ملا کر باتیں کرنے کی ہمت نہ تھی۔

''خالہ! اب چھوڑئے ان باتوں کو یہ بتائے کہ آپ تو اچھی خاصی انگلش بول لیتی ہیں۔ کہاں اور کس سے سیکھا ہے؟''

''یہ سب تمہارے خالو کا کرم ہے۔ وہ بڑے انگلش داں تھے۔ ایسی فراٹے دار انگلش بولتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ مجھے بھی سکھانے کی بڑی کوشش کی مگر میں کیا خاک سیکھتی۔''

''کیوں خالہ؟''

ایک تو ساس سسر سے فرصت ہی نہیں ملتی دوسرے ساس سسُر اتنے سخت تھے کہ اگر گھر خانہ داری میں ذرا بھی کوتاہی ہوجاتی اور شوہر کے ساتھ گڈمڈ کرتے دیکھ لیتے تو آفت آجاتی۔''

''خالہ یہ تو بتائیے، جب خالو اتنے اپٹوڈیٹ تھے تو آپ کو فلم دکھانے کے لئے تو ضرور لے جاتے ہوں گے؟''

خالہ دھیرے سے مسکرائیں اور ایک ادا سے بولیں۔

''ارے وہ تو مجھے روز ہی کہتے تھے لیکن میں راضی کہاں ہوتی تھی کہ میرے ساس سسر پرانے خیال کے بڑے سخت قسم کے انسان تھے۔ اگر انہیں ذرا بھی بھنک مل جاتی تو میری خیر نہ تھی'' خالہ ایک بار پھر مسکرائیں۔

''پھر ایک دن جو میری شامت آئی تو میں ان کی باتوں میں آگئی ہال میں ''زینت'' فلم لگی تھی۔ پورے شہر میں دھوم مچی تھی۔ خیر سے ہم دونوں بہانہ بنا کر گھر سے نکل پڑے۔ لیکن میری بری حالت تھی۔ دل دھڑک رہا تھا، قدم ڈگمگا رہے تھے۔ میں پورے وقت تمہارے خالو کا ہاتھ تھامے قرآنی آئتوں کا ورد کرتی رہی۔ جب فلم شروع ہوئی تو دل کو کچھ سکون ملا۔ لیکن جب ہیرو گھوڑے پر سے گر کر مرگیا تو دل زور سے دھڑکا اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی انھوں نے نہ اُدھر دیکھا نہ ادھر جھٹ میرا ہاتھ پکڑا اور ہال سے نکل گئے اور انہوں نے کان پکڑا کہ پھر ایسی غلطی کبھی نہ کریں گے۔

خالہ کا قصہ سن کر ہم لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ وہ اکثر بہت دلچسپ باتیں کرتیں۔ اور ہم لوگ دیر تک ان کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہتے۔ وہ جب بھی آتیں قصے کہانی کے ساتھ ساتھ دوچار نصیحتیں ضرور کرتیں۔

ٹی وی سے آگے ان کا علم محدود تھا لیکن ان کی جہاں دیدہ نگاہوں میں بہت ہی غور و فکر کی جھلک تھی۔ اگر انہیں کمپیوٹر کی کارگردی کا علم ہوتا تو وہ اس موضوع پر بھی لیکچر دینے سے نہ چوکتیں۔ جس میں بچے تو بچے بڑوں کے بگڑنے کا بھی امکان ہے۔

یہ الکٹرونک پاور سے آگے کا دور ہے۔ نت نئے مشنری آلات ایجاد ہوتے رہتے ہیں اس سے انکار نہیں کہ اس ایجاد نے علم کے سارے دروازے کھول دئے ہیں لیکن انسانی قدریں، تہذیب وتمدن پامال ہوتے جارہے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ساری ساری رات چیٹنگ کرتے رہتے ہیں اس کے بڑے برے اثرات دیکھنے میں آرہے ہیں۔

ٹنو بھی اسی کا شکار ہوگیا۔ وہ دن رات چیٹنگ کرتا رہتا لیکن والدین نے کبھی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ کس سے اور کیا باتیں کرتا ہے۔ گویا اس میں اس کے والدین کی عدم توجہی کا زیادہ ہاتھ ہے۔ اب ہاتھ ملنے سے کیا فائدہ۔

اب مجھے خالہ کی ایک ایک نصیحت یاد آرہی ہے۔ کتنی سچائی اور تجربہ تھا ان کی باتوں میں جیسے اس جنریشن والے ''دھت'' کہہ کر اڑا دیتے ہیں۔

شجر ممنوعہ

پورے پندرہ سال بعد ہم دونوں ملے تھے۔ چند لمحے دونوں ہی خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اس خاموشی کو یوسف ہی نے توڑا۔

''نازو تم یہاں؟ پھر قدرے توقف کے بعد انہوں نے افسردگی سے پوچھا کیسی ہو؟'' اس مانوس سی آواز نے میرے اندر ایک ہلچل سی مچادی پھر خود کو سنبھال کر کہا۔''اچھی ہوں اور جینے کا سہارا ڈھونڈنے آئی ہوں۔'' ''کیسا سہارا؟''، ''میں ایک بچہ گود لینا چاہتی ہوں۔''

''تم نے اس بچے کو کیوں ضائع کردیا جو تمہارے اندر پل رہا تھا۔''

اس غیر متوقع سوال پر مجھے ایک جھٹکا لگا لیکن میں نے سنبھل کر کہا۔

''کیونکہ وہ پوری زندگی میرے لئے ایک ناسور بن جاتا۔''

''تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''یہ سوال آپ خود اپنے آپ سے کر کے دیکھیں تو آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔''

کچھ دیر تک دونوں کے ہونٹوں پر خاموشی چھائی رہی دونوں ہی گزرے دنوں کی خوشگوار یادوں میں گم ہوگئے۔ اس بار پھر یوسف نے ہی خاموشی توڑی۔

''اب پوری زندگی کیسے گزرے گی؟'' ان کے لہجے میں ملال تھا۔

''جیسے اتنے دن گزری ہے۔'' میں نے ایک سرد آہ بھری اور قسمت کی ستم ظریفی پر دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ شاید مجھے دلاسہ دینے کے لئے ان کے پاس موزوں الفاظ نہ تھے۔ کہ یہ معاملہ ہی عجیب وغریب تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے اور مجھے یادوں کے بھنور میں چھوڑ گئے۔ دھیرے دھیرے ماضی کے در وا ہوتے گئے اور میں چند ساعتوں میں کئی سال پیچھے کی طرف لوٹ گئی۔

اس وقت میں سکنڈ ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ کالج کی بس پکڑنے کے لئے مجھے جس راستے سے گزرنا پڑتا تھا اس بیچ ایک نیا تعمیر شدہ بنگلہ تھا، جس کے گیٹ پر کھڑا ایک لڑکا مستقل مجھے گھورتا رہتا تھا۔ گرچہ اس نے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ نہ ہی کوئی فقرہ ہی کسا۔ لیکن نہ جانے کیوں یہ دو نگاہیں مجھے ہمیشہ ڈسٹرب کرتیں۔ اس لئے میں نے اپنا راستہ ہی بدل لیا۔

ایک شام جب میں کالج سے لوٹی تو معلوم ہوا کہ گھر میں کوئی مہمان آئے ہیں۔

''یہ کون ہیں؟ یہ جاننے کے لئے میں بے دھڑک ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئی۔ سامنے ایک معمر سی خاتون بیٹھی تھیں اور ساتھ میں ایک ملازمہ ٹائپ عورت تھی میں نے انہیں سلام کیا کچھ دیر کھڑی رہی لیکن زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہری کیونکہ میرا ہم عمر کوئی نہ تھا۔

دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میرے والدین کو یہ رشتہ بہت پسند آیا۔ ویسے بھی وہ اس فرض سے جلد از جلد سبک دوش ہونا چاہتے تھے کیونکہ میرے بعد میری دو بہنیں اور سیانی تھیں لہٰذا تھوڑی

چھان بین کے بعد یہ رشتہ طئے پا گیا۔

جب میں نے سکنڈ ایر پاس کیا تو مجھے رشتہ ازدواج سے منسلک کر دیا گیا اور میں بابل کا آنگن چھوڑ کر پیا کے دیس سدھاری۔

میرے سسرال میں میرے استقبال کی بڑی تیاری تھی۔ پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا شامیانے میں جابجا پھولوں کی لڑیاں لٹکائی گئی تھیں۔ اسی بیچ سے مجھے اندر لے جایا گیا نندیں میرے آزو بازو میرا ہاتھ تھامے تھیں۔ پھر مجھے ایک اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر رسمیں ہوتی رہیں۔ گئے رات مجھے حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ وسیع وعریض کمرہ بیلی چمبیلی کی مسحور کن خوشبوؤں سے بسا تھا۔

میں آنے والے لمحات کے تصور میں ڈوبی تھی۔ کچھ دیر بعد انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے اور میرے قریب بیٹھ کر اپنی چاہتوں اور بے تابیوں کا اظہار کرتے رہے۔ اور میں گھونگھٹ کے اندر مسکراتی رہی۔ وقت کیسے گزرا پتہ نہ چلا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب شب وصال کی سحر ہوئی۔

دوسرے دن طعام ولیمہ تھا مجھے سجا سنوار کر اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ لوگ تعریفی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی جملہ تھا، ماشاء اللہ کیا خوب جوڑی ہے خدا نظرِ بد سے بچائے۔ لوگ مجھے ہزاروں دعائیں دے رہے تھے اور میں اندر ہی اند اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھی۔ دوسرے دن میکے چلی گئی۔ پھر میکے اور سسرال آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا لیکن جلد ہی یوسف مجھے اپنے شامل وہاں لے گئے جہاں ان کی پوسٹنگ تھی۔ اب ہماری زندگی کا اک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی قربت میں کھو

گئے تھے۔ کب صبح ہوتی اور کب شام پتہ ہی نہیں چلتا۔

ویک اینڈ پر سیر و تفریح کا پروگرام بنتا۔ کبھی آؤٹنگ، کبھی ہوٹلنگ اور کبھی ہم سینما دیکھنے کے لئے نکل پڑتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ زندگی بہت بہت پر کیف گزر رہی تھی۔ لیکن اچانک ایک شام ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوگیا، جس نے میری ہنستی کھیلتی زندگی کو تہ و بالا کردیا۔

حسب معمول اس شام بھی مجھے آواز دیتے ہوئے یوسف اندر داخل ہوئے، نازو کہاں ہوتم! ان سے ملو، یوسف نے ایک معمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے میری پرورش بھی کی ہے اور دودھ بھی پلایا ہے بہت دنوں بعد پاکستان سے آئی ہیں اور مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئیں۔ سلام و دعا کے بعد میں چائے اور کھانے کے انتظام کے لئے باورچی خانہ کی طرف چل دی۔

میری عدم موجودگی میں وہ ان سے باتیں کرتے رہے۔ جب میں چائے اور کچھ لوازمات لے کر وہاں پہنچی تو یوسف بہت خاموش تھے۔ میں نے کوئی خاص نوٹس نہ لی اور اپنے کاموں میں مشغول ہوگئی لیکن اسی رات وہ خلافِ معمول کچھ زیادہ ہی خاموش لگے اس لئے ان سے میری زیادہ بات چیت نہ ہوسکی۔ دوسری صبح کسی ضروری کام کے سلسلے میں وہ شہر سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد دو دن میں نے بے چینی میں گزارے، جب وہ واپس آئے تو ہمارے گھر میں چند افراد بھی ان کے شامل تھے۔ اچانک انہیں دیکھ کر میں پریشان ہوگئی۔ میری چھٹی حس مجھے کسی طوفان کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔

ضرور مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ ابھی میں اپنی غلطی تلاش ہی کررہی تھی کہ یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ اسی عورت نے ہم دونوں کو دودھ پلایا ہے لہٰذا ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے شجر ممنوعہ ہیں۔ اس خبر سے میرا پورا وجود زلزلہ کی زد میں آگیا پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

ابھی میں اس صدمے کی کیفیت سے صحیح طور پر باہر بھی نہ نکل سکی تھی کہ ایک اور انکشاف نے مجھے ہلاکر رکھ دیا۔ یہ کیسی آزمائش تھی کہ میرے وجود میں ایک اور زندگی پل رہی تھی لیکن اسے ضائع کرنے کے تصور سے ہی دل کانپ رہا تھا کہ اک عورت ماں بننے کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ لیکن میری شخصیت کی اس تکمیل نے مجھے لہولہو کردیا تھا۔ لیکن ہر حال میں مجھے قدم تو اٹھانا ہی تھا۔

میری زندگی کی ساری خوشیاں درد و الم میں بدل چکی تھیں۔ وقت یونہی گزر رہا تھا۔ چاہے زلزلہ آئے یا طوفان اس کی رفتار میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

میرے والدین روز ہی ایک نیا رشتہ لے کر آجاتے اور مجھے سمجھاتے اور قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ سچویشن فیس کرنا میرے لئے بہت ہی دشوار تھا۔ نئے سرے سے ایک نئی زندگی ایک نئے شخص کے ساتھ شروع کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔

کچھ دنوں تک میں اداسیوں کے دشت میں بھٹکتی رہی لیکن کسی راستے کی تلاش میں تھی جس پر چل کر زندگی سہل ہوجائے۔ اخیر میں اپنی ادھوری تعلیم کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ والدین کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا اور میری تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

بی اے بی ایڈ کرنے کے بعد مجھے ایک اسکول میں جاب مل گئی۔ اب زندگی اک ڈھرے پر چل رہی تھی۔ کچھ وقت اسکول کی مصروفیت اور کچھ کلیگ کے ساتھ گپ شپ میں گزر جاتا۔ ویسے بھی اب میں عمر کے اس پڑاؤ پر تھی جہاں ٹھہراؤ آ گیا تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے میرے اندر ایک عجیب سی خواہش سر ابھارنے لگی تھی۔

جب بھی میں کسی بچے کو دیکھتی تو اسے پاگلوں کی طرح بے تحاشہ چومنے لگتی۔ بچے میری کمزوری بن چکے تھے۔ جوں جوں میری عمر بڑھتی جا رہی تھی اس جذبے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ گویا میں ایک نفسیاتی مریض بن چکی تھی۔

اور پھر کسی بچے کو گود لینے کے سلسلے میں مَیں سنجیدگی سے غور کرنے لگی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ یہی میرے لئے بہتر ہوگا۔

میں نے یتیم خانہ انچارج سے رجوع کیا۔ اور جب وہاں پہنچی تو اچانک یوسف سے میرا آمنا سامنا ہوگیا۔ کچھ دیر تک تو میں پندرہ سال بعد اس اتفاق پر بحرِ حیرت میں غرق رہی۔ پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نہ جانے کتنی دیر تک گزرے دنوں کی یادوں میں ڈوبی رہی۔ ان یادوں کا سلسلہ تو اس وقت ٹوٹا جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے، میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا، ہر طرف اندھیرا پھیل رہا تھا لیکن اس سے زیادہ اندھیرا میرے اندر تھا۔ جب مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا تو میں نے اس پر ہاتھ پھیرا وہ آنسوؤں سے تر تھا۔ شاید میں بہت دیر سے بے آواز رو رہی تھی۔ شاید میں اب تک اس غلط فہمی میں تھی کہ میں اپنی

زندگی میں آنے والے اس سانحہ کو بھلانے میں کامیاب ہوچکی ہوں لیکن نہیں اس چھوٹی سی غلطی نے میری زندگی میں زہر گھول دیا تھا جو قطرہ قطرہ میرے اندر ٹپک رہا تھا اور دن بدن مجھے موت سے قریب کر رہا تھا۔

جب مجھے اپنے اردگرد سناٹے کا احساس ہوا تو میں اٹھی اور شکستہ قدموں سے گھر کی طرف چل پڑی۔

غرور کا دیمک

مدت سے بند پڑی فائل کو اس نے ایک بار پھر کھولا جسمیں اس کے ڈیڈی کی ڈائری پڑی تھی۔ اس نے اسے پڑھنا شروع کیا۔

ooo

"آج میں یہاں بستر علالت پر پڑا ہوں اور مجھ سے ہزاروں میل دور میری بیٹی کی شادی کی شہنائیاں بج رہی ہیں۔ میرے کانوں میں شہنائیوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ اور دل میں ایک کسک ہے کہ میں اپنی بیٹی کو گلے لگا کر رخصت نہ کرسکا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے مجھے سفر کرنے کی اجازت نہ دی۔ میں چشم تصور سے سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔

دلہن بنی صاعقہ کا معصوم چہرہ، پاپا کی فکر مند نگاہیں، مصلی پر بیٹھی ہوئی دعا کے لئے امی کے اٹھے ہوئے ہاتھ، اور صائمہ کی آنکھوں سے متواتر گرتے ہوئے آنسو میرا دل درد سے بھر گیا، آنکھیں نم ہوگئیں۔ ایک عجیب سی بے قراری ہے۔ میں بڈ سے اٹھ کر دریچے کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ لیکن باہر کی فضا بھی میرے دل کی طرح تاریک ہے، مایوس ہوکر میں پھر بڈ پر آگیا اور سونے کی کوشش میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایسے ہی پریشان کن لمحوں کے درمیان میرے ذہن میں ماضی کے دریچے کھل گئے۔

ooo

میں اپنی زندگی کے یہ چند اوراق اپنی بیٹی صاعقہ کی نذر کر رہا ہوں کہ

شاید یہ اس کے لئے مشعل راہ ثابت ہو۔

ooo

اس قصے کا آغاز میں اپنے بچپن سے کررہا ہوں۔ میرا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ میرے والدین گاؤں میں شاہانہ زندگی گزار رہے تھے۔ جب میں چھ سال کا ہوا تو میرا داخلہ ایک انگلش میڈیم اسکول میں کروادیا گیا۔ اور مجھے ہاسپٹل میں ڈال دیا گیا۔ تاکہ وہاں میری تربیت اچھی ہو۔

اس ماحول میں میری زندگی کا انداز ہی بدل گیا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا جاگنا سب کچھ انگلش طرز پر ہونے لگا۔ یہ طرز مجھ پر اس قدر اثر انداز ہوا کہ میں تیزی سے اس تہذیب کوFollow کرنے لگا۔

میری پڑھائی کا سلسلہ چلتا رہا اور میں بتدریج اونچے کلاس تک پہنچتا رہا۔ میں پڑھنے میں اچھا خاصا ذہین تھا، ہر سال میرٹ کے ساتھ پاس ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک کامیاب انجینئر بن گیا۔

ooo

اس روز میں بہت خوش تھا جب میری تقرری بطور نیوی انجینئر ہوئی تھی۔ میرا ہڈکوارٹر بمبئی تھا لیکن گاہے گاہے میرا جہاز یورپ کے مختلف ممالک جاتا رہتا تھا۔ جب کسی ملک میں میرا جہاز لنگر انداز ہوتا تو میں اس ملک کی سیر و سیاحت سے خوب لطف اندوز ہوتا۔ مجھے دنیا بہت ہی حسین نظر آتی۔ اس طرح دو سال گزر گئے۔ پھر جلد ہی میرا پروموشن ہوگیا۔ اب میں جہاز کا کپتان تھا۔ پاپا میری ترقی سے بہت زیادہ خوش تھے اور اب انہیں میری شادی کی فکر ہونے لگی تھی۔

جب انہوں نے میریChoice پوچھی تو میں نے سارا اختیار انہیں

سونپ دیا۔ حالانکہ میں ابھی اپنی آزادی میں خلل اور پاؤں میں بیڑی ڈالنا نہیں چاہتا تھا مگر پاپا کے اصرار پر مجھے ہتھیار ڈالنا ہی پڑا۔

میری طرف سے سگنل ملتے ہی انہوں نے جھٹ پٹ میرا رشتہ طئے کردیا۔

ooo

آج میں ازدواجی زندگی کے کچھ قصے سنا رہا ہوں۔

پاپا نے میری شادی بہت ہی شاندار طریقے سے کی۔ ظاہر ہے کہ ان کی ساری امیدیں سارا شوق مجھ سے ہی وابستہ تھا۔

صائمہ نے جب ازدواجی زندگی کے حصار میں قدم رکھ ہوگا تو شوہر سے نہ جانے کتنی امیدیں وابستہ کی ہوں گی، کتنے سہانے خواب دیکھے ہوں گے۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا ہوگا۔ نئی سوچ، نئے خواب، نئے جذبے، چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو اس کے دل کے کسی گوشے میں جاں گزیں ہوں گی۔ لیکن میری سرد مہری نے شاید اس کی آرزوؤں اور جذبوں کو مجروح کردیا تھا اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے تھے اور وہ ایک دم بجھ سی گئی تھی۔ لیکن مجھے ان باتوں کی کب پروا تھی۔ مجھے والدین کے بے جا لاڈ پیار نے بہت ہی مغرور اور خود پسند بنادیا تھا۔

میں اپنی چھٹی کے دن گزار کر چلا گیا۔

ooo

میں فری اسٹائل زندگی گزارنے والا بچپن سے جوانی تک ہاسٹل میں رہنے والا تھا۔ ان بندشوں میں کب رہنے والا تھا۔ یہاں میرے لئے دلچسپیوں کی کمی نہ تھی۔ کلب کی رنگینیوں میں دوست احباب کے ساتھ گلیمر کے پیچھے

بھاگ رہا تھا۔ پاپا کے اصرار پر میں دوسری بار گھر گیا تو وہاں کی فضا عجیب بوجھل بوجھل سی لگی۔ پاپا کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور صائمہ کے چہرے پر یاسیت چھائی تھی جو اس کی ذہنی کیفیت کی غماز تھی۔ اور میں شرمندہ تھا کہ کہیں ں میں تو اس کا ذمہ دار نہیں؟ یہ سوال کئی بار میرے ہونٹوں تک آکے رہ گئے کہ خاموش رہنے میں ہی عافیت ہے۔

ooo

وہ ایک خوشگوار صبح تھی جب مجھے یہ خبر ملی کہ خدا نے مجھے ایک بچی عطا کی ہے۔ خبر کوئی انوکھی نہ تھی پھر بھی نہ جانے اس میں کون سی کشش تھی کہ میں بلا تاخیر وہاں پہنچ گیا۔ جب میں نے اس کومل کومل سے وجود کو دیکھا تو دل ایک عجیب انداز سے دھڑکا کہ یہ میری ہی ذات کا ایک حصہ تھی۔ میں دیر تک اسے چومتا رہا۔ اب میری دلچسپیوں کا وہی محور تھی۔ صائمہ بھی بہت خوش تھی جیسے اسے جینے کا سہارا مل گیا ہو۔ بچی کی آمد کے بعد ہم دونوں کے بیچ کا شگاف بھرنے لگا۔ جب بچی چھ سال کی ہوئی تو میں نے اسے بورڈنگ میں ڈال دیا۔ وقت نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ صائمہ کے ہاتھوں سے کھلونا چھن گیا لیکن اس نے کوئی احتجاج نہ کیا، صرف لبریز آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اب صائمہ کی زندگی میں کوئی چارم نہ تھا، نہ کوئی شوق نہ ولولہ نہ کسی سے کوئی گلہ جیسے اس نے عہد کرلیا ہو کہ چاہے ساری آرزوئیں آنکھوں سے اشک بن کر بہہ کیوں نہ جائیں وہ حرف شکایت زبان پر نہ لائے گی۔

ooo

وقت اسی طرح گزر رہا تھا اور اب میں عمر کے اس موڑ پر کھڑا تھا جہاں زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اچھے برے، غلط صحیح کا ادراک ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا

مجھے بھی یہ احساس ہو رہا تھا کہ صائمہ غیر محسوس طور پر مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے جیسے ہم ایک ندی کے دو کنارے ہوں۔ کاش وہ مجھ سے لڑتی جھگڑتی اپنا آپ منواتی، اپنا حق مجھ سے چھینتی۔ لیکن وہ انا کی دیوی اتنی ارزاں کیسے ہوسکتی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر لکھی ہوئی عبارت سب کچھ عیاں کر رہی تھی۔ اور میں نادم و شرمسار تھا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ ہاں میں ہی تو وہ تھا جس نے اپنے ناروا سلوک سے بار بار اس کے چہرے کو آنسوؤں سے بھگویا تھا۔ ہاں میں ہی تو وہ تھا جس نے اس کے لبوں پر بار بار سسکیاں بکھیری تھیں لیکن اس کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کو کبھی اپنی انگلیوں سے پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ اور آج میں یہ سوچ رہا ہوں کہ گزرتے ہوئے وقت کے دوران میں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

ooo

وقت کی اہمیت کا اندازہ اس کے گزر جانے کے بعد ہی ہوتا ہے میں دولت کی چمک دمک اور دوست یار کی صحبت میں اپنی خوشیاں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ حقیقی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی دوست احباب زندگی بھر ساتھ نبھاتے ہیں۔

اب دشت تنہائی سے نکلنے کے لئے مجھے ایک ایسے گھر کی تمنا تھی جو صرف اینٹ اور سیمنٹ کی بنی ہوئی ایک عمارت نہ ہو بلکہ وہ گھر جہاں پیار اور محبت ہو، خوشیاں ہوں، سکون اور آسودگی ہو۔ جہاں محبت کے چراغ جل رہے ہوں۔ جہاں ہر طرف پیار کی خوشبو پھیلی ہو۔

ooo

مگر افسوس زندگی نے مہلت نہ دی۔

چھ ماہ سے میں بستر پر پڑا ہوں اور موت و زیست کی اذیتوں سے دوچار یہ دعا کررہا ہوں کہ اے خدا مجھے تھوڑی مہلت اور دے دے تاکہ جن کی خوشیاں میں نے چھینی ہیں انھیں لوٹا سکوں۔ لیکن شاید میری دعا بارگاہ الٰہی سے لوٹ آئی۔ اب ایسا لگتا ہے جیسے میری زندگی کے بہت کم دن باقی رہ گئے ہیں موت روز بروز مجھ سے قریب ہوتی جارہی ہے۔ اب تو ڈاکٹر بھی میری زندگی سے ناامید ہوچکے ہیں۔ نہ جانے سانس کی یہ ڈور کب ٹوٹ جائے۔ اس سے قبل میری بیٹی صاعقہ کے نام ایک پیغام ہے کہ غرور اور انا کو کبھی اپنے پاس بھٹکنے نہ دینا۔ یہ ایک ایسی دیمک ہے جو زندگی کی ساری خوشیوں کو چاٹ جاتی ہے آج میری داستانِ زندگی پوری ہوگئی۔ الوداع میرے پیارو الوداع۔ الوداع۔

جائے پناہ

پورے بارہ سال بعد وہ کھلی فضا میں سانس لے رہا تھا اور اجنبی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا لیکن نہ کوئی جگہ اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی اور نہ کوئی چہرہ ہی شناسا سا تھا۔ وہ کہاں آگیا، یہ جگہ وہ تو نہ تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کے اٹھائس سال گزارے تھے۔ اسی جگہ کھیل کود کر گبرو جوان بنا تھا۔ لیکن آج گردش زمانہ نے اسے اتنا کمزور کردیا تھا کہ اس سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ وہ اپنی زندہ لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے خود کو گھسیٹ رہا تھا۔ بارہ سال کی قید بامشقت نے اس کی توانائی چھین لی تھی۔ مشکل سے وہ چالیس سال کا ہوگا لیکن ساٹھ سال سے کم کا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ اب اسے بھوک بھی ستارہی تھی۔ وہ کسی طرح گرتے پڑتے اور لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ایک اوسط درجہ کے ہوٹل میں پہنچا، وہاں ایک بنچ پر ڈھے گیا۔

پاس آکر بیرے نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''کھانے کو کچھ ملے گا؟ اس نے لرزتی آواز سے پوچھا۔

''کیا چاہئے صاحب؟''، ''کیا ہے؟''

''پوری بھاجی، پراٹھا کلیجی، نان قورمہ......''

''پوری بھاجی لے آؤ۔''

کھانا آتے ہی وہ اس پر اس طرح سے ٹوٹا جیسے برسوں کا بھوکا ہو۔

خوب سیر ہوکر کھایا۔ بہت دنوں بعد وہ ایسا کھانا کھارہا تھا۔ اب تو وہ کھانے کا ذائقہ ہی بھول گیا تھا۔

جب وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو پھر پریشانیوں نے اسے گھیر لیا۔ اب کہاں جائے کیا کرے۔ ماں! ماں کی یاد آتے ہیں اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ نہ جانے اب وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ پہلے تو وہ ہر ایک دو ماہ بعد اس سے ملنے آتی تھی پھر نہ جانے اس کے ساتھ کون سی گھٹنا گھٹی کہ اس نے ایک دم آنا بند کردیا۔ اب اسے گھر تلاش کرنا بھی مشکل ہورہا تھا کیونکہ ہر طرف اونچی اونچی بلڈنگیں بن گئی تھیں۔ لیکن محلّہ کا نام اب تک اس کے ذہن میں محفوظ تھا کسی طرح لوگوں سے دریافت کرتے ہوئے وہ اس محلّہ تک پہنچ گیا۔

لیکن اب وہا بھی نہ کوئی گلی باقی تھی نہ کوئی مکان، ہر طرف پختہ عمارتیں اسے مایوس کررہی تھیں۔ کہیں بھی اس کے مکان کا نام ونشان باقی نہ تھا۔ وہ مایوس ہوکر ایک بلڈنگ کے سامنے بنے ہوئے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا اور ماضی میں ڈوب گیا اور کئی سال پیچھے کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ ماں صبح سویرے کھرپی اور چنگیری لے کر مزدوری کے لئے نکل جاتی اور وہ رات کی بچی کھچی روٹی کھاکر پاٹھ شالہ کا رخ کرتا ساتھ میں رامو چاچا کی بیٹی کجری بھی ہوتی۔ ایک بجے جب وہ پاٹھ شالہ سے لوٹتا تو ماں آچکی ہوتی۔ وہ جلدی جلدی کھانا بناتی پھر وہ دونوں مل کر کھاتے۔ کبھی رامو چاچا جب کام پر گئے ہوتے تو کجری بھی اس کے ساتھ کھاتی۔ ماں جب کبھی کوئی اچھی بھلی چیز لاتی تو اسے بھی ضرور کھلاتی، تو وہ ماں کو ٹوک دیتا ''میرے حصے سے کاٹ کر اسے کیوں دیتی ہو ماں؟'' وہ کجری کو چڑھا کر کہتا۔ ''وہ بیچاری بے ماں کی ہے اس پر مجھے بہت دیا آتی ہے۔''

''میں بھی تو بن باپ کا ہوں، رامو چاچا روز دونا لاتے ہیں پر مجھے کہاں دیتے۔ انہیں مجھ پر دیا کیوں نہیں آتی؟''

''یہ بھی مجھے چڑھا چڑھا کر کھاتی رہتی ہے۔ ایک دن مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے اس کا دونا ہی الٹ دیا، لو اب کھاتی رہو۔''

''تو نے ایسا کیوں کیا؟ یہ بہت بری بات ہے۔ اگر تم کسی سے اچھا برتاؤ کروگے تو آج نہ کل وہ تم سے ویسا ہی کرے گا۔ اور تمہارا دوست بن جائے گا'' ماں دیر تک اسے سمجھاتی رہی۔ وہ بہت سرل سبھاؤ کی تھی ماں کو یاد کرکے اک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی طرح کھیلتے کودتے لڑتے جھگڑتے ان دونوں نے لڑکپن کی سرحد پار کرلی۔ اس نے پاٹھ شالہ جانا چھوڑ دیا اور راج مستری کا کام سیکھنا شروع کردیا۔ ماں کا بھی یہی کہنا تھا کہ ڈاکٹر کلکٹر تو بننا نہیں ہے، کیوں وقت برباد کریں پھر جلدی ہی ماں نے کجری سے اس کی سگائی کردی۔

اس وقت جس بلڈنگ میں وہ کام کررہا تھا وہ اس کے گھر کے قریب ہی تھا بہت تیزی سے وہاں پر کنسٹرکشن کا کام چل رہا تھا اور وہ دن رات کام میں مشغول رہتا۔ یہاں تک کہ اسے کھانے کی بھی فرصت نہ ملتی۔

کجری ہر دن اس کا کھانا لے کر پہنچ جاتی اور پورے احاطہ میں اچھل کود کرتی رہتی اور وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ ایک دن جب وہ اس کا کھانا لے کر آئی تو اس سے رہا نہ گیا۔

''تو روز روز میرا کھانا کیوں لے کر آجاتی ہے؟ گھر پاس ہی ہے میں کسی وقت وہاں جاکر کھالوں گا۔''

''تم وقت پر نہیں جاتے سارا دن بھوکے رہ جاتے ہو۔''

''نہیں میں بھوکا نہیں رہتا۔ میں ماں کو بھی منع کردوں گا کہ وہ میرا کھانا نہ بھیجا کرے۔''

لیکن دوسرے دن وہ پھر حاضر ہوگئی اور اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا وہ آہستگی سے کھسک گئی اور دور جا کر کسی سے ہنسی ٹھٹھا کرنے لگی۔ کجری کی اس حرکت پر اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلایا۔

''کس سے باتیں کررہی تھی؟''

''وہ ٹھیکیدار بابو ہیں۔

''تو ان سے کیوں اور کیا باتیں کرتی ہے، تو اب بچی نہیں ہے، تیری سگائی ہوگئی ہے۔ اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ تو کسی ایرے غیرے سے اٹھکیلیاں کرتی پھرے۔ آج کے بعد کبھی اگر میں نے تجھے کسی سے باتیں کرتے یا کود پھاند کرتے دیکھا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

کئی ہفتے چین سے گزر گئے، لیکن ایک دن پھر اس نے وہی حرکت کی جسے دیکھ کر اس کا خون کھول گیا۔ وہ کام کر رہا تھا چھینی اس کے ہاتھ میں تھی اس نے ایسا نشانہ لگایا کہ چھینی سیدھے کجری کے سینے میں پیوست ہوگئی۔

تراخ کی آواز کے ساتھ اس کا وجود زمین پر آگیا۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ وہ چاروں طرف سے گھر گیا۔ بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ ویسے بھی اس کے جسم میں سکت کہاں تھی۔ سارا جسم بے جان تھا اور آنکھیں کجری کے چہرے پر جمی تھیں۔ فوراً ہی پولس آگئی اور اسے حراست میں لے لیا۔ کیونکہ بہت سارے لوگ چشم دید گواہ تھے۔ کئی روز تک اسے حوالات میں رکھا گیا۔ پھر مقدمہ چلا اور بالآخر اسے چودہ سال

قید بامشقت کی سزا سنادی گئی۔

اس نے ایک جھرجھری لی۔ اس کا پورا بدن سن ہورہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور ایک دوکان کی سیڑھی پر سوگیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد دکان کے مالک نے اسے اٹھادیا۔

''اٹھو اٹھو! یہ کوئی سونے کی جگہ ہے؟''

اب وہ بیچ سڑک پر کھڑا جائے پناہ تلاش کررہا تھا۔ کچھ دور پر اسے ایک پارک نظر آیا جس میں کئی بنچ بچھے تھے۔ اسی بنچ پر اس نے رات گزاردی۔ دوسرے دن سے تھوڑی بہت مزدوری کرنے لگا۔ جو پیسہ بھی ملتا اس سے پیٹ کی آگ بجھاتا۔ اور رات اسی بنچ پر جاکر سوجاتا۔ لیکن ایک رات تیز بارش نے اسے بے پناہ کردیا اور ایک بار پھر وہ جائے پناہ تلاش کررہا تھا، تبھی اسے ایک بنگلہ نظر آگیا جس کا گیٹ کھلا تھا۔ کمپاؤنڈ کے اندر دو گاڑیاں کھڑی تھیں جس کی حفاظت کے لئے شیڈ ڈالا ہوا تھا، وہ اسی شیڈ کے اندر تھوڑی سی جگہ نکال کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی اسے پوری طرح نیند بھی نہ آئی تھی کہ دربان نے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور گیٹ سے باہر کردیا۔ ساری رات بارش ہوتی رہی اور وہ بھیگتا رہا۔ صبح وہ تیز بخار میں بھن رہا تھا۔ شام میں جب طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو اسے ہوش آیا۔ رات کا سارا واقعہ نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ دل شدتِ غم سے پھٹا جارہا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ شاید دل انسانیت کی موت پر ماتم کررہا تھا اس خودغرض دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہورہا تھا۔ کاش اس کے ہاتھوں پھر کسی کا قتل ہوجائے۔ اور ایک بار پھر وہ اسی جیل خانہ میں پہنچ جائے کہ کم سے کم وہ ایک جائے پناہ تو تھی۔

قید ہوس

مدت ! ۔ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اس چہرے کو دیکھ رہی تھی جس کے خد و خال مسخ ہو چکے تھے اور سر کے بال آدھے سے زیادہ چاندی کے تاروں میں بدل چکے تھے۔ وقت کتنا گزر گیا تھا یہ اسے یاد نہیں لیکن وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے جس دن شیخ ابراہیم کا قتل ہوا تھا۔ یہ سنسنی خیز خبر آگ کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے پورے شہر میں پھیل گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے کوٹھی کا باہری حصہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا جن میں عام لوگوں کے علاوہ میڈیا والے، اخبار رپورٹر، اور پولس کے چند افراد بھی شامل تھے۔ مشتبہ لوگوں سے پوچھ تاچھ جاری تھی۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور کوئی سرا ہاتھ نہ لگ سکا۔ ڈیڈ باڈی پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ سوئم کے دن بھی پولس کے چند ذمہ دار افسران ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اب بیان دینے کے لئے اس کی باری تھی۔ جب اس کی طلبی ہوئی تو وہ سر پر سفید پلو ڈالے آہستگی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

''تو آپ ہی شیخ صاحب کی نئی بیگم ہیں؟'' ''جی ہاں''، '' آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے؟''، ''تقریباً چھ ماہ'' ''کیا یہ شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی تھی؟''، ''جی ہاں۔''، وہ کون سی مجبوری تھی جس نے ایک عمر رسیدہ شخص سے شادی کرنے پر آپ کو مجبور کیا؟''

''دیکھئے یہ میرا نجی معاملہ ہے۔''، ''خیر چھوڑئے، یہ بتائے کیا آپ اس شادی سے خوش تھیں؟''، ''جی ہاں''

''آپ کو کب معلوم ہوا کہ آپ کے شوہر کو کسی نے زہر دے کر ہلاک کردیا؟''، ''جب میں صبح ان کے کمرے میں آئی۔''

''اس رات کتنے بجے تک آپ ان کے کمرے میں تھیں؟''

''تقریباً گیارہ بجے تک۔'' اس طرح کے اور چند سوالوں کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں، پیشانی عرق آلود تھی، حلق اور زبان خشک ہو رہے تھے۔ اور کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز گونج رہی تھی۔

''عظمیٰ اب آ بھی جاؤ کب تک میرے ضبط کو آزماتی رہوگی؟ آؤ اب ہم دونوں مل کر ایک نئی خوشگوار زندگی کی شروعات کریں۔''

یہ آواز عمر کی تھی جس نے جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا اور جو پل پل اس کے انتظار میں تڑپ رہا تھا لیکن وہ تو ہمیشہ دل کی سنتی آئی تھی دماغ سے کام لیا تھا۔

وہ ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی تھی لیکن اس کے خیالات بہت بلند تھے۔ طبیعت میں بڑی نفاست تھی۔ جب کبھی وہ گندے سے بچوں کو دیکھی تو نفرت سے منہ موڑ لیتی۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی۔ اس کی اڑان بھی بڑھتی گئی۔ کبھی چڑھ کر اماں کہتیں۔

''ذرا نخرے تو دیکھو، جیسے کہیں کی شہزادی ہو۔''

''میری بیٹی کسی شہزادی سے کم ہے کیا؟'' ابا لاڈ سے کہتے۔ اسی لاڈ

پیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، وہ اپنی چھوٹی بڑی، جائز ناجائز، ہر خواہش ہر بات منوالیا کرتی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو ایک ایسے اسکول میں داخلہ کے لئے بضد ہوگئی جس کا اسٹینڈر بہت ہائی تھا اور فیس اس کے والدین کی استطاعت سے بہت زیادہ۔ لیکن اس بار بھی وہ اپنی بات منواکر ہی رہی۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ بچپن کی معصوم تمنائیں، بکھری بکھری سوچیں اب اس کے دل و دماغ پر مکمل طور پر مسلط ہوچکی تھیں۔ جب اس نے آئی اس سی پاس کیا تو ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھنے لگی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ہار کر نرسنگ کی ٹریننگ لینی شروع کردی اور تین سال میں وہ ایک ٹرینڈ نرس بن گئی۔

اپنے گھر کے ابتر حالات کو بہتر بنانے کے لئے وہ اپنی صلاحیت کو کیش کرانا چاہتی تھی۔ اس لئے وکینسی کالم روز دیکھتی اور آخر ایک دن اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جب اس کی نظر اس اشتہار پر پڑی۔

''ضرورت ہے ایک بوڑھے بیمار شخص کی دیکھ بھال کے لئے ایک ٹرینڈ نرس کی، ضرورت مند حضرات مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع کریں۔''

والدین اور عمر کی سخت مخالفت کے باوجود وہ اپنی ضد پر اڑی رہی حالانکہ گھر میں عمر ہی ایک ایسا شخص تھا جسے وہ قابل اعتنا سمجھتی تھی جو اس کا چچا زاد تھا اور منگیتر بھی تھا۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے وہ بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گئی۔

وہ ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ بل بجانے پر ایک باوردی دربان نے گیٹ کھولا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی سوال کرتا، اس نے اپنے آنے کا سبب بتادیا۔

''اندر آجائیے'' اس نے راستہ دیتے ہوئے کہا اور ایک لمبی راہ داری طئے کرتے ہوئے اسے ایک شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچادیا، جو قیمتی اور منقش فرنیچر، ریشمی پردے، ایرانی قالین اور نادر و نایاب شوپیس سے آراستہ تھا۔ ایر کنڈیشن کی فرحت بخش ٹھنڈک اور موسیقی کی دھیمی دھیمی لئے نے اسے کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچادیا۔ اس خواب ناک ماحول میں وہ خود کو بھول گئی۔ وہ کون ہے، کہاں ہے؟ تبھی ایک جواں سال شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وہ ایک دم ہوش میں آگئی۔ وہ شیخ ابراہیم کا بیٹا شیخ کامران تھا۔ اس شخص نے اس سے چند سوالات کئے اور خاطر خواہ جواب ملنے پر اسے منتخب کرلیا۔

چند دنوں بعد اس نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک اسے ڈیوٹی دینی پڑتی۔

نئی جگہ نئے ماحول میں وہ نئے نئے تجربوں سے گزر رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز کا جائزہ لیتی اور حسرت سے سوچتی۔ کاش وہ بھی اس ماحول میں پیدا ہوتی۔ اس کے پاس بھی ایسی ہی کوٹھی، ایسی ہی عیش و آرام کی چیزیں ہوتیں۔ دولت کی چمک دمک نے اس کے جذبۂ شوق کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ کچھ دن یوں ہی گزر گئے کہ ایک بار پھر کامران نے اسے طلب کیا۔ گھبراتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ''سر آپ نے مجھے بلایا ہے؟'' ''ہاں بیٹھو تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' ''مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے سر؟'' ''نہیں دیکھو تم سے ایک ریکوئسٹ ہے۔''

''ریکوئسٹ نہیں سر حکم دیجئے۔'' ''کہنا یہ ہے کہ رات ڈیوٹی دینے والی سسٹر کو کوئی پرابلم آگئی ہے۔ اب ان کی جگہ پر مجھے کسی اور سسٹر کا انتظام کرنا

پڑے گا۔ لیکن چونکہ مجھے تمہارا کام پسند آ گیا ہے اس لئے بہتر ہوتا کہ وہ ڈیوٹی بھی تم ہی سنبھال لیتی۔ پیسے کی فکر نہ کرنا تمہاری امید سے زیادہ مل جائے گا۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "میں مشورہ کر کے جواب دوں گی۔ جب وہ وہاں سے نکلی تو اس کے ذہن میں ایک خلفشار تھا۔ عجیب و غریب خیالات و خواہشات دل و دماغ میں چکر لگا رہے تھے اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا، باوردی ڈرائیور اس کے انتظار میں گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی ڈرائیور نے گیٹ کھولا اور اس کے حکم کی تعمیل میں گاڑی آگے بڑھا دی۔

پھر اس نے دیکھا زیور سے لدی وہ ایک آراستہ بڈ روم میں داخل ہوئی اور آئینہ کے سامنے کھڑی دیر تک خود کو پر شوق نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر سارے زیورات اتار کر شب خوابی کا لباس زیب تن کیا اور نرم و گرم بستر پر دراز ہو گئی۔ ابھی اس خواب سے وہ پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائی تھی کہ حسب معمول ایک جھٹکے سے ٹیکسی اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر رک گئی اور وہ خواب سے بیدار ہو گئی۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ "یہ کیسے خواب وہ دیکھنے لگی ہے۔ کس طلسم میں کھو گئی ہے۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ کتنے خدشات، کتنے وسوسے نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ تبھی اس کے ہوس اس کے جنون نے کانوں میں سرگوشی کی "یہ سارے خوف سارے خدشات بے بنیاد ہیں۔ اگر سچ ہے تو صرف سونے چاندی کی چمک اور سکوں کی کھنک جو اپنے اندر بے پناہ طاقت رکھتی ہے۔ یہ نہ سوچ کون کیا کہتا ہے، یہ دیکھ بلندی کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار عمر سے کیا تو وہ چکرا گیا۔ "کیا تم ایک بڈھے سے شادی کرو گی؟"، "پلیز تم منع

نہیں کرنا۔"
"کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئیں؟"، "نہیں میں نے بالکل ہوش وحواس میں یہ فیصلہ کیا ہے۔"
"پھر ایسا غلط فیصلہ کیوں کیا؟ کیا ہر خوشی دولت سے ہی حاصل ہوتی ہے؟"، "بیشک، ورنہ ایک خالی خولی انسان گوشت کے لوتھڑے کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو بالکل بے دست و پا ہے۔"
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس حد تک بھی جاسکتی ہو۔ عظمیٰ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو، میرے لئے نہیں، اپنے لئے ہی سہی۔ وہ بیمار بوڑھا تمہیں کیا دے سکتا ہے؟"
"میرے بھولے شاہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ شادی میں کسی خوشی کے لئے نہیں کررہی۔ یہ تو ایک سودا ہے۔ وہ بوڑھا صرف کچھ دنوں کا مہمان ہے پھر میں آزاد ہوں گی۔"، "اس کے بعد تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"
"تم دیکھتے جاؤ"، "یہ اتنا آسان نہیں ہے پیاری۔ دولت کی پٹی تمہاری آنکھوں پر ایسی چڑھی ہے جس کے پار تمہیں ہم سب کا چہرہ نظر ہی نہیں آرہا ہے۔
"اپنی محبت کے جال میں الجھا کر میرے ارادے کو متزلزل نہ کرو عمران میں نے ہمیشہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کیا ہے۔ اور یہ تو ایک ایسا فیصلہ ہے جس کا شرعی اور قانونی حق مجھے حاصل ہے۔"
"اس سرپھری لڑکی کو کون سمجھائے۔ اسے اندازہ نہیں ہے، جو کھیل وہ کھیلنے جارہی ہے وہ کس قدر خطرناک ہے۔ جس میں ہار کے سوا اور کچھ نہیں۔"
عمر نے بڑے دکھ سے سوچا۔

ماں باپ تو اس خبر سے سکتے میں آ گئے، بہت سمجھایا لیکن اس پر تو جنون سوار تھا بے جا لاڈ پیار نے اسے بہت خود سر بنا دیا تھا۔

وہ جب اپنا فیصلہ سنانے کے لئے شیخ کامران کے پاس گئی تو وہ بالکل پرسکون تھی۔ چہرے پر کوئی گھبراہٹ کوئی پریشانی نہ تھی۔

''سر مجھے آپ کا حکم منظور ہے لیکن میری ایک شرط ہے۔'' ''وہ شرط کیا ہے؟'' ''سر مجھے شیخ کی زوجیت میں لیا جائے۔''

''کیا تم ہوش میں تو ہو؟'' کامران حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ''جی سر مجھے شیخ صاحب کی خدمت کر کے دلی سکون ملتا ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ آخری دم تک ان کی خدمت کرتی رہوں۔

''کہیں یہ لڑکی میرے ساتھ کوئی چال تو نہیں چل رہی ہے؟'' وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ ادنیٰ سی لڑکی میرا کیا بگاڑے گی۔ بابا کی خدمت کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنے والد کو رضامند کیا اور پھر بڑی سادگی سے اس کا عقد شیخ ابراہیم سے ہو گیا۔ نہ تو وہ دلہن بنی، نہ عروسی لباس زیب تن کیا۔ نہ سجی سنوری نہ ٹیکا نہ جھومر لگایا۔

پچاس ہزار کیش اس کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا گیا تا کہ اپنی ضرورتوں کے لئے اس عنایت کے بدلے اس پر بہت ساری پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ مہینہ میں صرف ایک آدھ بار کچھ دیر کے لئے میکے جانے کی اجازت تھی۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا، یہ تو اس کے خواب کی تعبیر بھی نہ تھی۔ وہ جب بھی میکے جاتی ماں باپ کی آنکھوں میں اداسی کے علاوہ ناراضگی بھی ہوتی اور عمر تو ایک بہت ہی صبر آزما دور سے گزر رہا تھا، شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا۔ وہ نظریں چرا لیتی پھر کہتی۔ ''صبر کرو میں بہت جلد واپس آ رہی ہوں۔''

وہ اسے دلاسا دیتی۔ ''لیکن دیکھو عظمیٰ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا کہ نکلنے کا راستہ ہی نہ ملے۔ اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے خود کو فنا نہ کر دینا۔'' ''فنا تو تم ہو ہی جاؤ گی اگر اس قفس سے نکلنے کا راستہ نہ ملا'' اس کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔

بہت جلد وہ اس ماحول اور اس زندگی سے گھبرا گئی تھی۔ جدھر بھی نظر ڈالتی ایک سونے پن کا احساس اسے بے چین کر دیتا۔ اتنی بڑی کوٹھی اسے اب پنجرہ لگنے لگی تھی جہاں سونے چاندی کے کٹورے میں اسے دانہ پانی مل جاتا تھا۔ اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو کر آنکھوں میں چبھنے لگے تھے۔ نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھٹ کی آواز سے یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

دوسرے دن اس ملازم کو بھی طلب کیا گیا جو حادثہ کے روز غیر حاضر تھا۔ ''ہاں تو محرم علی تم اس حادثہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں حضور اس روز تو میں صبح سویرے ایک ضروری کام سے اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔'' جانے سے پہلے والی رات تم نے کوئی آواز کوئی چیخ سنی تھی؟'' ''ٹھہریے، کچھ دیر دماغ پر زور ڈالنے کے بعد اس نے کہا۔'' ہاں یاد آیا کوئی ڈھائی، تین بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میں ضرورت سے اٹھا تھا اور اس طرف سے گزر رہا تھا تو مجھے ایک کراہ بھری چیخ سنائی دی تھی۔ دریچے کا پردہ سرکا ہوا تھا، میں نے دیکھا میڈم تیزی سے کمرے سے نکل رہی تھیں۔'' ''اور کیا دیکھا؟''

''نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اور تو کچھ نظر نہیں آیا حضور۔'' ایک بار پھر اس کی طلبی ہوئی۔ ''مسز شیخ! محرم علی کے بیان کے مطابق آپ رات ڈھائی بجے سے تین بجے کے درمیان شیخ صاحب کے کمرے میں تھیں۔ کیا یہ سچ

ہے؟'' ''جی ہاں،'' ''لیکن آپ نے تو اپنے پہلے بیان میں کہا تھا گیارہ بجے کے بعد ان کے کمرے میں نہیں گئی تھیں؟''

''میں یہ کہنا بھول گئی تھی کہ میں ہر روز تین بجے رات میں بھی انہیں دوا دینے کے لئے جایا کرتی تھی لہٰذا حسب معمول اس روز بھی گئی تھی۔ اور اس وقت تک شیخ صاحب بھلے چنگے تھے۔''

''لیکن اب آپ کی ذات مشکوک ہوگئی ہے لہٰذا آپ کو حراست میں لیا جاتا ہے۔ اس وقت اسے ایسا لگا جیسے اسے کسی نے گڈھے میں پھینک دیا ہو۔

تین دن تک لاک اپ میں اس سے سچائی اگلوانے کی کوشش جاری رہی لیکن وہ لگاتار یہی کہتی رہی۔ ''ہاں یہ سچ ہے کہ ڈھائی بجے رات میں میں ان کے کمرے میں انہیں دوا کھلانے گئی تھی لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ کب اور کیسے ان کی موت واقع ہوئی۔''

لیکن ہمارے شواہد کے مطابق یہ خون منصوبہ بند پروگرام کے تحت ہوا ہے۔ بہر کیف یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور بہت دنوں تک چلتا رہا۔ سارے ثبوت اُسے مجرم ثابت کر رہے تھے لہٰذا سزا میں تھوڑی تخفیف کے بعد بارہ سال قید بامشقت کی سزا اسے سنا دی گئی۔

ماں باپ کو غش پر غش آرہے تھے۔ لیکن وہ پتھر کی بن چکی تھی۔

جب لیڈی کانسٹبل نے اسے پولس کی گاڑی میں بٹھایا تو اس نے پلٹ کر ایک الوداعی نگاہ سبھوں پر ڈالی۔ اس ایک نظر میں کیا کچھ نہ تھا۔ دکھ، پچھتاوا، بے بسی۔ جس نے عمر کے دل کو زخمی کر دیا۔

''عظمٰی یہ کیا کیا تم نے؟'' ایسا کیوں کیا؟ ہم تمہیں کیسے بھلا پائیں گے، زندگی کے ہر موڑ پر تمہاری یادیں ہمیں خون کے آنسو رلائینگی'' اس کے

لہجے میں جذبات کی تڑپ تھی اس نے دونو ں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا اور سسک پڑی۔ اب آنسو ہی آنسو اس کا مقدر بن چکا تھا۔ دن ہفتے، ہفتے مہینے، اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے یہاں تک کہ آٹھ سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس بیچ اسے خبر ملتی رہی کہ ماں باپ گزر گئے۔ عمر دوسرے ملک سدھار گیا۔ ہر حادثہ پر اسے ایک نیا زخم لگتا اور اس میں اٹھتی ہوئی ٹیس اسے بے چین کرتی۔ کسی نے بھی تو اس کا انتظار نہ کیا اس دوران ایک دن وارڈن نے اسے آکر بتایا کہ ایک شخص اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ جب اس سے ملی تو ذہن پر زور ڈالنے پر بھی اسے پہچان نہ سکی۔

''شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میرا نام محرم علی ہے۔ میں آپ کا ملازم ہوں۔ اور آپ کا مجرم اور گنہگار بھی۔ میں ہی سیٹھ صاحب کا قاتل ہوں۔ میں ہی مجرم ہوں۔ پھر میں نے جھوٹی گواہی دے کر آپ پر ایک اور ظلم کیا۔ میں دوہرے جرم کا مرتکب ہوں۔ نہ جانے مجھ پر کیا جنون سوار تھا کہ مجھے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں انتقام کی آگ میں اس وقت سے جل رہا تھا جب میرے بابا کو ناکردہ گناہ کی سزا سنائی گئی تھی۔ میں دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ گولی کس نے چلائی تھی، مجرم کون تھا لیکن مجھ پر اتنی دہشت طاری تھی کہ میں بابا کے دفاع میں کچھ نہ بول سکا۔ ایک تو میں کم عمر تھا دوسرے غریبوں کی سنتا ہی کون ہے۔ اس کی حیثیت کیڑے مکوڑے سے زیادہ نہیں جسے پاؤں کے نیچے کچل دینا آسان ہے۔ بابا سلاخوں کے پیچھے چلا گیا لیکن وہ جیل کی سختیاں زیادہ دنوں تک برداشت نہ کرسکا۔ جلد ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ جب ماں کو یہ خبر ملی تو اس پر دل کا زبردست دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسی۔ اور میں زندگی کی اس پُر خار اور کٹھن راہوں پر تنہا رہ گیا۔ اس غم والم کی کیفیت میں نہ جانے کتنے ماہ

و سال گزر گئے لیکن میرے اندر انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ اب بھی ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ اسی حویلی میں بابا کی جگہ میری بحالی ہوگئی۔ دل تو چاہتا تھا ابھی فوراً یہ جگہ چھوڑ دوں جہاں بابا کے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے لیکن وہاں سے جانے کے بعد میں اپنا انتقام پورا نہیں کرسکتا تھا۔ اب میں موقع کی تلاش میں تھا اور جیسے ہی موقع ملا میں نے اپنا حساب بے باق کردیا۔

لیکن یقین مانئے اس وقت سے میں ایک پل بھی سکون سے نہ رہ سکا۔ میرا ضمیر مجھ پر دن رات لعنت بھیج رہا تھا۔ جرم کے بوجھ تلے دب کر نہ میں جی رہا تھا نہ مر رہا تھا۔ اب اس عذاب سے چھٹکارا پانے کا یہی ایک راستہ تھا کہ میں خود کو قانون کے حوالے کردوں۔ سو میں آپ کے پاس اپنے جرم کا اقرار کرنے آیا ہوں۔ یہی بیان میں عدالت میں بھی دوں گا۔

وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، زبان ساکت تھی لیکن دل سے یہ آواز آرہی تھی۔ ''اب اس کا کیا فائدہ۔ کیا تم میرے گزرے ہوئے وہ قیمتی آٹھ سال لوٹا سکتے ہو؟''

محرم علی نے عدالت میں بھی اقبال جرم کیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ گئیں۔ اور وہ ایک جیل سے چھوٹ کر دوسرے جیل میں آگئی۔ یہی اس کا مقدر تھا۔ اب زندگی بھر اسے یہیں رہنا تھا۔ ایسی ہی کوٹھی کی اس نے تمنا کی تھی۔

تاوان

کئی مہینوں کی ذہنی کشمکش اور انتشار کے بعد آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ فیصلے کی گھڑی بہت کٹھن تھی۔ لیکن دل کے اوپر سے ایک بھاری پتھر سرک گیا تھا۔

میں نادم اور شرمسار تھا لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جو سزا مجھے ملی تھی اس میں اس ہستی کو شریک کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ جو مجھے سب سے زیادہ عزیز، سب سے زیادہ پیاری تھی۔ جس کا دامن پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا تھا۔ جس نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی تھی، جس نے میرے بکھرے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔

اگر رشتوں کے شکنجے میں جکڑا اور احسان کے بوجھ سے دبا ہوا میں اتنا بے بس نہ ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ میری بزدلی اور سعادت مندی نے مجھے بہت دکھ دیئے۔

میں اس گاؤں کا باشندہ تھا جو ایک روایتی گاؤں ہے۔ اس کا اپنا ایک الگ ہی رکھ رکھاؤ تھا، رعب تھا دبدبہ تھا۔ وہاں کے رؤساء اور سابق زمینداروں کے حکم کے خلاف پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ نچلے طبقے کے لوگوں اور کمیوں کی غلطیوں پر ایسی سزا دی جاتی کہ سات پشتوں تک لوگ یاد رکھتے ہماری بلند و بالا حویلی اپنے جاہ و جلال کے اعتبار سے پورے گاؤں میں بے مثال تھی۔ میرے والد جوانی ہی میں ملک عدم کو سدھار گئے تھے۔ لہٰذا نظیر احمد

صاحب یعنی میرے بڑے ابو ہی اب ساری دولت اور جائداد کے مختارِکل تھے۔ حسب دستور وہ دس بجے بیٹھک میں آجاتے۔ دربار لگتا اور گاؤں والوں کا مسئلہ حل کیا جاتا۔ کبھی کبھی کسی مجرم کو پکڑ کر ان کے سامنے پیش کیا جاتا پھر جرم کے حساب سے اسے سزا ملتی۔ کبھی کبھی یہ سزا اتنی عبرت ناک ہوتی کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ اس وقت تک گیارہ بارہ سال کا ہوچکا تھا۔ بڑے ابو مجھے اپنے پاس خاص طو پر اس لئے بیٹھاتے تھے کہ میں وہاں کے طور طریقوں اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرسکوں۔ پھر مجھے آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر بھیجنے کا پروگرام بنا۔ میری روانگی کے دن بڑے ابو کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی بہت اداس اور مغموم تھیں۔ رو رو کر انھوں نے اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔ ان کی ضد تھی کہ مجھے شہر نہ بھیجا جائے یا پھر انھیں بھی میرے ساتھ جانے کی اجازت مل جائے۔ اب تک وہ جس بات کی ضد کرتیں اسے پورا کرکے ہی دم لیتی لیکن اس معاملہ میں ان کی ایک نہ چل سکی تھی کیونکہ لڑکیوں کو باہر بھیجنا اس گاؤں کی روایت کے خلاف تھا۔ اور بڑے ابو کو روایت کی خلاف ورزی کرنا گوارا نہ تھا۔

وہاں سے رخصت ہوتے وقت میں بھی بہت اداس تھا بلکہ کئی دنوں تک اداس رہا۔ آپا کی روتی ہوئی صوت ہر وقت نظروں میں گھومتی رہتی نہ جانے رو رو کر انہوں نے اپنا کیا حال بنالیا ہوگا۔

پورے پانچ سال تک وہ اس حویلی اور ماں باپ کے دل پر تنہا راج کرتی رہیں۔ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنی رہیں۔ ان کی ہر خواہش زبان سے نکلتے ہی پوری ہوجاتی۔ ان کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا رہتا لیکن جس دن میں دنیا میں آیا، انہوں نے اپنے سارے کھلونے پھینک دئے۔ انہیں تو

وہی گڈا چاہئے تھا جو چھوٹی امی کی گود میں تھا۔ وہ ہر وقت ان کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتیں۔ بچے کو گود میں لینے کی ضد کرتیں۔ کبھی نظر بچا کر بچے کا منہ کھول کر دیکھتیں اور کبھی آنکھیں۔

''چھوٹی امی ، یہ بولتا کیوں نہیں۔ میرا گڈا تو چابھی دینے سے ہنستا بھی ہے اور بولتا بھی۔ اس کی چابھی کہاں ہے؟''

''یہ گڈا نہیں ہے بیٹا، تمہارا بھائی ہے، چھوٹی امی نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

''بھائی ایسا ہوتا ہے کیا؟'' وہ ساتھ کھیلتا ہے جیسے گلشن کا بھائی۔'' ''یہ ابھی چھوٹا ہے جب بڑا ہو جائے گا تو یہ بھی تمہارے ساتھ کھیلے گا''، میرے بڑے ہونے پر جب بڑی امی مجھے یہ قصہ سناتیں تو میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

جب میں پانچ سال کا تھا تو ایک ناگہانی حادثہ میں میرے ابو امی چل بسے۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا تھا۔ میں رو رو کر بے حال ہو جاتا۔ ان کے پاس جانے کی ضد کرتا۔ پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتا۔ ایسے میں بڑے ابو اور بڑی امی نے مجھے گلے لگا لیا اور آپا نے میرے بکھرے وجود کو سمیٹ لیا۔ اور شاید ان کی سنگت کا ہی اثر تھا کہ دھیرے دھیرے امی ابو کی یادیں میرے ذہن سے محو ہوتی گئیں۔ میں سارا دن آپا کا دامن تھامے ان کے پیچھے پیچھے لگا رہتا۔ ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ کھیلتے کودتے بڑے ابو کے کمرے میں ان کے آزو بازو بیٹھنے کے لئے یا بڑی امی کی گود میں بیٹھنے کے لئے۔ ''پہلے ہم، پہلے ہم'' کی گردان کرتے ہوئے ہم بڑے ہوتے گئے۔

یہ سارے مناظر آج بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔

میں سال میں دو بار چھٹیوں میں گھر جاتا۔ آپا میری منتظر رہتیں۔ ہم دونوں کے لئے بے موسم بہار آجاتی۔

وقت پر لگا کر اڑتا جارہا تھا اور ہمارے قدم جوانی کی طرف بڑھتے جارہے تھے۔

اب میں اکثر انہیں چھیڑتا۔ ''اب تو میری آپا بہت جلد پرائی ہو جائینگی۔ سچ بتایئے آپا آپ مجھے بھول تو نہ جائیں گی؟'' میں ان کے پلو سے کھیلتے ہوئے کہتا۔

''دھت پگلے کہیں، بہن بھی بھائی کو بھولتی ہے میں تو ہر وقت تجھے یاد کرتی رہوں گی۔ میرا اکلوتا بھائی'' وہ میری ٹھوڑی پکڑ کر کہتیں۔

''کبھی کبھی میں واقعی اداس ہوجاتا کہ جب آپا چلی جائیں گی اور میں یہاں آؤں گا تو خود کو کتنا تنہا پاؤں گا۔''

لیکن اس ک نوبت نہیں آئی ایک دن بڑے ابو نے مجھے طلب کیا اور جو کچھ انہوں نے کہا، اسے سنتے ہی میں چکرا گیا اور گرنے ہی والا تھا کہ انہوں نے اپنے بازو میں مجھے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو یہ کوئی نئی یا انہونی بات نہیں ہے۔ ہمارے پرکھوں میں شروع سے ہی ایسا ہوتا آیا ہے۔ یہ ناجائز بھی نہیں ہے۔ خود ہمارے رہنما، ہمارے پیغمبرؑ نے پندرہ سال بڑی عورت سے عقد کیا تھا اور ان کی وہی شادی سب سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔''

''مجھے اس سے کب انکار ہے۔ لیکن میں نے ایسا خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا''

''اگر نہیں سوچا ہے تو اب سوچ لو۔ سودا گھاٹے کا نہیں ہے فائدہ ہی

فائدہ ہے۔ بلا شرکت غیرے تم پوری جائداد کے مالک بن جاؤ گے۔ مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں ہے کہ کسی غیر خاندان کا شخص آکر ہماری جائداد پر قبضہ جمائے۔

''لیکن بڑے ابو یہ کیسے ممکن ہے؟''

''ہر وہ بات ممکن ہے جو جائز ہے'' انہوں نے مجھے آگے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں لاجواب ہو کر شکستہ قدموں سے اپنے کمرے میں آگیا اور عجیب کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔

''تو بڑے ابو آپ کو اپنی محبتوں اور شفقتوں کو کیش کرانے کا وقت آ ہی گیا'' شطرنج کی چال بڑی ہوشیاری سے چلی گئی تھی۔ گھوڑے کو گھیر گھار کر قابو میں کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب میں بچہ نادان نہ تھا ہر داؤ پیچ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ طمع انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ بھی جانتا تھا۔ اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ ہر بات کی واقفیت رکھتا تھا۔ ہماری جائداد کا آدھا حصہ وقف تھا جس کا متولی اس خاندان کا بڑا لڑکا ہوا کرتا تھا۔ بڑے ابو کو اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے ان کے بعد یہ حق مجھے پہنچتا تھا۔ ایسی صورت میں ان کی بیٹی کو جائداد کا صرف چوتھائی حصہ ہی مل سکتا تھا۔ اور وہ اپنی بیٹی کو پوری جائداد سے بے دخل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کاش بڑے ابو آپ اس موضوع پر کسی اور طریقے سے بات کرتے تو ممکن تھا کوئی اور صورت نکل آتی۔

میں نے ساری رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دی۔ صبح جب کمرے سے باہر آیا تو دل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ میں آپا کی نظروں کا سامنا کرنے سے پہلے وہاں سے چلا آیا۔ پھر بڑے ابو کے خط کا تانتا سا بندھ گیا۔ ایک ہی

مضمون، ایک ہی بات، ایک ہی تقاضہ، اگلی چھٹی میں میں گھر نہیں گیا تو وہ خود پہنچ گئے۔ مجھے گلے سے لگایا، شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پہلے پیار و محبت سے مجھے قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ میں کسی صورت اس رشتے کے لئے رضامند نہ ہوں تو احسان فراموش کہا، نالائق، نافرمان اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔

پھر قطع تعلق کی دھمکی دی۔ ان کا رویہ بہت ہی جارحانہ ہوگیا۔ اب میں صیح معنوں میں بے سہارا ہوگیا تھا۔ اب ان کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گھبرا کر میں روایت پر قربان ہوگیا۔

عقد کے وقت زبان اقرار کررہی تھی لیکن دل و دماغ نہ جانے کہاں کھوئے تھے۔ نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی۔ جب مبارک سلامت کی آواز آئی تو ہوش آیا۔ اس وقت تک میں اس بندھن میں بندھ چکا تھا۔ رات کے آخری پہر مجھے حجلۂ عروسی میں پہنچادیا گیا۔

وہ سامنے سرخ زرتار جوڑا پہنے معصومیت اور پاکیزگی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ لیکن دلہا کہاں تھا میری نظریں تلاش کررہی تھیں۔ تیسرے دن میں امتحان کا بہانہ بنا کر وہاں سے نکل پڑا۔

بڑے ابو کے تقاضے کے باوجود پھر میں لوٹ کر گھر نہیں گیا کہ اس شفیق ہستی کو کہاں تلاش کروں گا جو میرے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی دوڑ کر مجھے اپنے بازو میں سنبھال لیتی تھی۔

لیکن پھر نہ جانے وہ کونسی کشش تھی جو مجھے گھر کی جانب کھینچ کر لے گئی۔ لیکن ہم دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار حائل تھی کہ ہم نے ایک دوسرے کو اس نئے رشتے کے طور پر قبول ہی نہیں کیا تھا۔

پھر طلاق نامہ اور جائداد سے دست بردار ہونے کے کاغذات ان کے ہاتھوں میں تھما کر کسی کو کچھ بتائے بغیر نامعلوم سمت کی طرف چل پڑا۔ اس عزیز ہستی سے ناطہ توڑتے اور اپنی جائداد سے دست بردار ہوتے وقت دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے اس خاندان میں پیدا ہونے کا تاوان تو ادا کرنا ہی تھا۔

انتقام

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ ہر طرف سکوت طاری ہے۔ ایسے میں کبھی کبھی گیتوں کے بھبوکے اور پہرے دار کی ''جاگتے رہو'' کی صدائیں فضا میں ارتعاش پیدا کردیتی ہیں۔ میں کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا ہوں لیکن آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں ہے میرے اندر ایک نامعلوم سی خلش ہے۔

دھندلی دھندلی یادیں ذہن کے پردے پر ابھر آئی ہیں۔ ان میں ایک شبیہ صائمہ کی ہے۔ جو میری ہمسفر اور غمگسار تھی۔ بچپن میں میرے پیارے دوست، اپنے پرائے جب مجھے چھیڑ کے میری مجروح شخصیت کا مذاق اڑاتے تو وہ ڈھال بن جاتی۔ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار ہوجاتی۔

میرا بچپن کب مجھ سے جدا ہوا اور کب میں سنِ بلوغ تک پہنچا کچھ پتہ نہ چلا۔ البتہ صائمہ مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ لیکن اب بھی جب میں کبھی اس سے ملتا ہوں تو اس کے انداز میں وہی خلوص، آنکھوں میں وہی پیار اور باتوں میں وہی اپنا پن ہوتا ہے۔ یقیناً وہ مجھ سے پہلے بھی پیار کرتی تھی اور اب بھی پیار کرتی ہے۔ لیکن میری زندگی میں شامل نہیں ہوسکتی، یہ اس کی مجبوری ہے۔ لیکن یہ دل بھی عجیب شئے ہے۔ اس چیز کے لئے مچلتا ہے جو اس کی دسترس سے دور ہوتی ہے۔ صائمہ بھی اس کی دسترس سے دور تھی۔ جبکہ میرے اندر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش تھی، کسی ہمسفر کی آرزو تھی جو میری

تنہائی کی شریک ہو، مجھ سے راز و نیاز کی باتیں کرے، کبھی پیار کی باتیں، اور کبھی تکرار کرے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیا دو جسموں کا ملاپ ہی محبت کی معراج ہے ہم ایک دوجے کو اپنی روح میں بسا کر بھی تو جی سکتے ہیں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں۔ جب اپنے سراپے پر نظر ڈالتا ہوں تو سوچتا ہوں ایسی لا حاصل آرزو کا کیا فائدہ۔ میں ایسے خواب دیکھتا ہی کیوں ہوں جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ میں اپنے ادھورے وجود کی صلیب اپنے کندھوں پر اٹھائے بھٹکتا رہتا ہوں۔ اپنے آپ سے راہِ فرار تلاش کرتا رہتا ہوں۔ کوئی مجھے خبطی کہتا ہے، کوئی دیوانہ، میرے درد کو کوئی نہیں سمجھتا۔ اگر کسی کے دل میں درد اٹھتا بھی ہے تو بس اتنی دیر کے لئے جتنی دیر چکنے پتھر پر پانی کے قطرے ٹھہرتے ہیں۔

ہاں ماں ہی ایک ایسی ہستی ہوتی ہے جسے اپنے بچوں کی ہر کمی کا احساس ہوتا ہے اور اگر اس کا بس چلے تو اپنے بچوں کی خوشی کے لئے آسمان سے چاند تارے بھی توڑ کر لے آئے لیکن قادر مطلق نے سارے اختیار انسان کے ہاتھوں میں نہیں دئے ہیں۔ میری ماں بھی بے بس ہے لیکن وہ میرے لئے دکھی رہتی ہے۔ شاید اسے بھی نیند نہیں آرہی ہے۔ وہ بار با کمرے میں آکر جھانکتی ہے۔ میری زندگی کی طرح رات بھی دھیرے دھیرے سرکتی جارہی ہے اور قطرہ قطرہ احساسِ محرومی میرے وجود کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ اپنی بے کیف اور نا مراد زندگی کے اس موڑ پر آکر میرے اندر جینے کی رہی سہی آرزو بھی دم توڑ گئی ہے۔ لیکن اچانک یہ آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

''یہ زندگی اللہ کا عنایت کردہ ایک بے بہا تحفہ ہے جیسی بھی ہے اللہ کی امانت ہے اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔''

اس جذبے کے تحت آج میں نے اپنی ساری محرومیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور اپنی زندگی کا رخ دوسری طرف پھیر دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

پھر مطالعہ کو اپنا مقصدِ حیات بنالیتا ہوں۔ کتابوں کے انبار میں خود کو گم کرلیتا ہوں۔ بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کر ڈالتا ہوں۔ شعر و ادب کا، فلسفہ کا، تواریخ اور مذہب کا۔

کسی کتاب میں میں نے پڑھا کہ: ''انسانوں کو جو دولت، خوشی، آرام اور سکون ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے ایک نعمت ہے اور جو پریشانی، دکھ اور تکلیف ملتی ہے وہ اس کے اپنی گناہوں کی سزا ہوتی ہے۔''

یہ سوال صدائے بازگشت بن کر ہر وقت میرے ذہن میں گونجتا رہتا ہے۔ میں اپنی لائبریری میں محو مطالعہ تھا کہ اچانک ابو اندر داخل ہوئے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر حزن و ملال چھایا تھا۔ آتے ہی انہوں نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

''بیٹا میں تمہارا دکھ جانتا ہوں۔ تمہاری محرومی کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں ہی تمہاری خوشیوں کا قاتل ہوں۔ بیٹا مجھے معاف کردینا۔

میں بہت تھک گیا تھا۔ بچے کبھی نعمت ہوتے ہیں اور کبھی زحمت بھی بن جاتے ہیں۔ اہل وعیال کی کفالت کرتے کرتے میری کمر ٹوٹ گئی تھی شاید میرے بزرگوں نے یہ دعا دی تھی۔ ''دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔''

''دودھوں نہانا تو نصیب نہ ہوا لیکن خدا نے اولاد کی دولت سے جی بھر کر نوازا۔ جب مجھے خبر ہوئی کہ ایک بچہ اور میرے گھر آنے والا ہے تو میرے ہوش اڑ گئے۔ مزید اور بوجھ اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہ تھی۔ میں کسی

صورت اس بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اور اگر کسی کے اندر ذرا بھی ایمان اور یقین میں کمزوری آجائے تو قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر شیطان کو موقع مل جاتا ہے۔ وہ ایسے ٹیڑھے میڑھے راستے دکھاتا ہے جن پر چل کر انسان صحیح راستہ بھول جاتا ہے۔ میں بھی صحیح راستہ بھول گیا اور مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوگئی جو ناقابل تلافی ہے۔

لیکن یہ کہاوت سچ ثابت ہوئی کہ ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔''

جسے دنیا میں آنا ہوتا ہے وہ کسی صورت آہی جاتا ہے۔ تم بھی دنیا میں آئے لیکن عبرت کا مقام بن کر کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔

ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ کسی تیز دوا کے اثر سے جسم کا یہ حصہ ڈیولپ نہ ہوسکا۔ اور اب پچھتاوے کے سوا چارا بھی کیا تھا۔ لیکن بیٹا تم مایوس نہ ہو۔ اب میڈیکل سائنس اتنی ایڈوانس ہوچکی ہے کہ کچھ بھی ناممکن نہیں رہا ہے۔'' میں اپنی ساری جمع پونجی تمہارے علاج پر خرچ کردوں گا۔''

میں حیرت اور حسرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''کیا کوئی اولاد بھی اپنے والدین پر بوجھ بن سکتی ہے؟''

اور پھر میری نظریں کسی معجزہ کی امید میں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

ادھورا سفر

میں نے جب سنا کہ باسط بھائی نے اپنی بیگم کو طلاق دے دی تو مجھے ان کے صحیح الدماغ ہونے پر شبہ ہونے لگا۔ ابھی کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے کہ پورے خاندان والوں کی مخالفت مول لے کر انہوں نے شادی کی تھی اماں ابا سمجھا سمجھا کر ہار گئے تھے۔

ارے بیٹا کیا رکھا ہے اس ٹھاٹھی نگوڑی میں، نہ باوا نہ بھیا نہ ذات کا پتہ نہ خاندان کا۔'' مگر ان کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا اور عشق بھی ایسا کہ اللہ کی پناہ۔ گریبان چاک کرنے کی نوبت آتے آتے رہی۔ پھر اچانک یہ کیا ہوگیا، کیسے ہوگیا۔ باسط بھائی کوئی بچہ نہ تھے اور یہ گڈے گڈی کا کھیل نہ تھا کہ جب تک جی چاہا کھیلے کودے پھر توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ مگر ان سے پوچھے تو کون پوچھے، کیسے پوچھے۔ انہوں نے تو خود کو ایک کمرے میں مقید کرلیا تھا۔ باسط بھائی مجھ سے کچھ بڑے تھے لیکن ہم دونوں میں دوستوں جیسا تعلق تھا۔ وہ اپنی ہر چھوٹی بڑی خوشی اور پریشانی مجھ سے ضرور شیئر کرتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے عشق کی داستان بھی مزے لے لے کر مجھے سنائی تھی۔ ان ہی کی زبانی۔

''وہ ایک گرمی کی شام تھی۔ آفس سے نکلنے کے بعد مجھے بڑی پیاس لگنے لگی۔ سوچا کسی فرحت بخش جگہ پر بیٹھ کر ٹھنڈا پیا جائے چنانچہ ایک ریستوراں میں داخل ہوا۔ سامنے ایک خوبصورت سی لڑکی بیٹھی تھی ۔ اس کے

چہرے میں بلا کی کشش اور معصومیت تھی۔ میرے قدم خود بخود اس طرف اُٹھ گئے اس کے بازو والی میز اتفاق سے خالی تھی۔ اطمینان سے بیٹھ کر میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔ ڈرنک کے دوران وقفے وقفے میں دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ لیا کرتا تھا۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا کیونکہ بار بار کبھی وہ گھڑی کی طرف دیکھتی اور کبھی گیٹ کی طرف۔ جب وہ آنے والے کا انتظار کر کر کے تھک گئی تو واپس جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی ربوٹ کی طرح اس کے پیچھے ہولیا۔ باہر نکلنے کے بعد بھی وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر پوچھا کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور خوف زدہ ہونے کی بجائے بڑی سنجیدگی اور نرمی سے کہا۔"میرا کزن آنے والا تھا لیکن شاید اسے فرصت نہ مل سکی۔ اب میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتی۔"

"آپ کو کہاں جانا ہے چلئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"جی شکریہ میں چلی جاؤں گی تھوڑی ہی دور میرا ہاسٹل ہے۔"

"ڈرئیے نہیں میں بحفاظت تمام آپ کو پہنچادوں گا۔ تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ میرے پیچھے بیٹھ گئی۔"

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔؟"

"مجھے مونا کہتے ہیں، ویسے میرا پورا نام منور سلطانہ ہے۔"

"تو آپ ہاسٹل میں رہتی ہیں؟"، "جی"

"پڑھتی ہیں؟"، پڑھتی تھی"

اب نہیں پڑھتی؟"، "نہیں! کسی مجبوری کی وجہ سے پڑھنا چھوڑ دیا؟"

ایک موڑ پر اس نے گاڑی رکوائی۔"بس مجھے یہیں اترنا ہے۔" وہ شکریہ ادا

کر کے چلی گئی۔ اور میرا دل بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس سے دوبارہ ملنے کی آرزو میں میں ہر ایک دو روز بعد اس رستوراں میں پہنچ جاتا لیکن وہ کہیں نظر نہ آتی۔ کافی دن گزر گئے اور میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ اچانک ایک روز وہ مجھے اسی رستوراں کے گیٹ پر مل گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور باتیں کرتے ہوئے ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''کیا پینا پسند کریں گی؟ میں نے اخلاقاً پوچھا۔ ''کیوں تکلف کرتے ہیں۔ بس وہ آتا ہی ہوگا۔'' ''کون؟'' ''وہی میرا کزن'' کزن کے بارے میں سن کر میں کچھ بجھ سا گیا۔

''ٹھیک ہے جب تک کچھ ہلکا پھلکا ہو جائے۔'' میں نے اسنیکس اور کافی کا آرڈر دیا۔

اس روز ہم نے بہت ساری باتیں کیں۔ اتنی ساری کہ ہمیں وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ اچانک اس نے پہلو بدلا۔ ''ارے اتنی دیر ہوگئی اور وہ اب تک نہیں آیا اب مجھے چلنا چاہئے'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلئے میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔'' ''چلیے۔''

اس روز وہ فوراً میرے ساتھ جانے کے لئے رضامند ہوگئی۔ میں نے اسے ہاسٹل کے قریب اتارا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں سرشار سا دل ہی دل اس کے کزن کو دعائیں دے رہا تھا۔ پھر ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب وہ تنہا ہی ہوتی۔ اسے کسی کزن کا انتظار نہ رہتا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں چچا چچی نے اسے پالا ہے۔ یہاں وہ پڑھنے کے لئے آئی تھی لیکن کسی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا اب وہ واپس چلی جائے گی۔ اس خبر نے مجھے مایوس کر دیا لیکن میں نے تو دل میں ٹھان لیا تھا کہ اسے اپنا بنا کر رہوں گا۔

''مونا! میں تمہارے چچا سے مل کر تمہیں ان سے مانگنا چاہتا ہوں۔''
میں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''خدارا مجھے مایوس نہ کرنا'' اس نے ہنس کر میری باتوں کو ٹال دیا۔

لیکن میرے بار بار اصرار کرنے سے اس نے کہا۔ ''باسط میری حقیقت جان کر تمہیں مایوسی ہوگی۔''

''کیسی حقیقت؟'' ''سچ یہ ہے کہ نہ میرے کوئی چچا چچی ہیں نہ ماں باپ۔ میں ایک یتیم و بے سہارا لڑکی ہوں ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رہتی ہوں اور کام دھندہ کر کے گزر بسر کرتی ہوں۔ میرا خیال دل سے نکال دو میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔''

وہ دھیرے دھیرے کھل رہی تھی اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا لیکن بقول شخصے عشق اندھا اور بہرا ہوتا ہے جب اس کا بھوت سر پر سوار ہوتا ہے تو نہ کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ کچھ سنائی۔

اور سچ یہ ہے کہ میں گردن گردن تک اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا۔ اس سے دست بردار ہونا اب میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں ہر حال میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا اور ایسا ہی ہوا بھی۔''

چلئے جو ہوا سو اچھا ہوا خدا آپ دونوں کی زندگی کو کامیاب بنائے۔ لیکن میری دعا قبول نہ ہوئی۔

جب باسط بھائی کچھ سنبھلے تو میں نے اس ٹریجڈی کی وجہ پوچھی۔
''انھوں نے وجہ کو راز ہی رہنے دو تو بہتر ہوگا۔''
انھوں نے افسردہ لہجے میں کہا۔
لیکن ایک دن انہوں نے خود اس راز سے پردہ ہٹادیا۔ گھر والے بھی

اسے پسند کرنے لگے تھے۔ ان چھ ماہ کے خوشگوار شب و روز کیسے گزر گئے پتہ بھی نہ چلا لیکن ایک دن میری پر سکون زندگی کی ندی میں ایک پتھر آگرا۔

ایک روز جب میں آفس سے آیا تو مونا کو کہیں نہ دیکھ کر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ وہ فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

''مجھے زیادہ پریشان نہ کرو اب میں تم سے نہیں مل سکتی۔''، ''کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟''

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری ایک دوست ہے مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''تو مل لو کیا حرج ہے بلکہ اپنے گھر بلالو۔''

''نہیں وہ اچھی لڑکی نہیں ہے میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔

بات آئی گئی ہوگئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب وہ کھوئی کھوئی اور خوف زدہ سی رہنے لگی تھی۔ میں نے کئی بار وجہ پوچھی لیکن وہ ٹال جاتی۔ اس روز بھی میں آفس سے سویرے آگیا تھا۔ مونا کے کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ مونا فون پر کسی سے کہہ رہی تھی۔

''میں کتنی بار تم سے کہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔

خدا کے واسطے میری پر سکون زندگی میں زہر نہ گھولو۔ اب میرا ایک گھر ہے شوہر ہے۔ تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔''

میری آہٹ سن کر اس نے جھٹ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے میری طرف مڑ گئی۔

''آج بہت سویرے آفس سے آگئے؟''

''آفس میں میرا دل لگتا ہی کب ہے۔'' اس کی مسکراہٹ اور گہری

ہوگئی۔ لیکن چہرے پر جو گھبراہٹ کے آثار تھے وہ میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ ویسے بھی مین لفظ بلفظ سب کچھ اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔ میرا ذہن ہر وقت الجھا الجھا سا رہنے لگا۔ دل ہر وقت اس گتھی کو سلجھانے اور اس راز کو فاش کرنے کی دھن میں لگا رہتا۔ اور آخر ایک دن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ نہ جانے یقین اور اعتماد کا وہ کون سا لمحہ تھا جب اس نے سب کچھ اگل دیا۔

''میرے والدین میرے بچپن میں ہی فوت ہوچکے تھے۔ چچا چچی نے مجھے پالا لیکن ان کا سلوک میرے ساتھ بہت ہی ناروا تھا۔ میں رنجیدہ اور پریشان رہتی۔ کبھی کبھی میں گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی۔ اسی کمزور لمحے سے اس لڑکے نے فائدہ اٹھایا جو چچی کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کا ڈرامہ کھیلا اور پھر شادی کا جھانسا دے کر یہاں لے آیا اور ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رکھا۔ جب کئی ہفتے گزر گئے تو میں نے اس سے کہا۔ ''آخر تم کب شادی کروگے؟ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔

''لوگوں کا کیا ہے یہ تو ان کی عادت ہے۔ میں خود کوشش میں لگا ہوں۔ بس مجھے اکثر گھمانے کے لئے لے جاتا، مجھے اپنے دوستوں سے ملاتا۔ کبھی مجھے گھنٹوں ان کے پاس چھوڑ کر چلا جاتا۔ اس نے میرے پر کاٹ دیے تھے۔ اور میں اس کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ اس بیچ تم مجھے مل گئے۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا اور اب مجھے برباد کرنے کے لئے آگیا ہے۔ نہ جانے کہاں سے اسے میرا فون نمبر مل گیا ہے۔ وہ روز دھمکی دیتا ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے بدنام کرکے میرا جینا حرام کردے گا اب میں کیا کروں؟'' وہ سسک کر روپڑی اور میرے دل و دماغ میں آندھیاں چلنے

لگیں۔ میری زندگی میں ایک طوفان آگیا کیسے اس طوفان کو روکا جائے؟ کیسے اپنے خاندان اور والدین کی عزت بچائی جائے؟''

یہ سوچ کر میں پاگل ہوتا جارہا تھا۔ اور پھر میں اپنے آپ میں نہ رہا اور وہ ہوگیا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔''

ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

یہ آپ نے اچھا نہیں کیا باسط بھائی۔ اسے پھر اسی جہنم میں جھونک دیا۔ اتنا تو سوچا ہوتا۔

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

برزخ

اس نے آنکھ کھول کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کوئی رسیوں میں جکڑا ہوا کوئی الٹا لٹکا ہوا، کسی کے گرد آگ دھدک رہی تھی۔ عجیب ہیبت ناک منظر تھا۔ اس جم غفیر میں ایک شخص بڑا ہی پرسکون بیٹھا تھا۔ اس شخص کا چہرہ شناسا لگا تو اس نوارد نے پیش قدمی کی۔

''السلام علیکم! بھائی صاحب۔''

''وعلیکم السلام! کب آئے؟''

مجھے کچھ یاد نہیں، میں تو اچھا خاصا سویا تھا جب آنکھ کھلی تو خود کو یہاں پایا۔ نہ جانے میں کہاں ہوں، میرے بچے بیوی کہاں ہیں۔ میں تو انہیں پکار پکار کر تھک گیا ہوں۔ بھائی صاحب آپ تو جانتے ہوں گے کہ یہ کونسی جگہ ہے؟''

''یہ برزخ ہے یہاں قیامت تک رہنا ہوگا۔''

''کیا کہا قیامت تک ؟ وہ سکتے میں آگیا۔ میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ میرے بزنس کا کیا ہوگا، میرے پیسے جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ تو ڈوب جائیں گے، میرے بچے پائی پائی کو محتاج ہوجائیں گے'' وہ بے حد پریشان تھا۔

''دنیا کی فکر چھوڑیے اب اللہ اللہ کیجئے اور خدا کا شکر ادا کیجئے کہ ابھی تک آپ کو کوئی سزا نہ ملی ہے۔'' نووارد کے کچھ وقفے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی بھائی صاحب؟'' وہ شخص مضحکہ خیز انداز میں مسکرایا۔

''جناب آپ کیسی بے وقوفی کی باتیں کررہے ہیں۔ کیا یہ دنیا ہے کہ ادھر سے اُدھر گھومتے رہو، من مانی کرتے رہو۔ نووارد بہت ہی گھبرایا ہوا تھا۔

''اب کیا ہوگا بھائی صاحب؟

''اب انشاء اللہ ہماری آخری منزل جنت ہوگی۔''

''یہ کیا اس نے تو کبھی جنت اور دوزخ کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔

اس شخص کو پرسکون دیکھ کر وہ حیرت زدہ تھا۔

''بھائی صاحب! کیا آپ یہاں مزے میں ہیں؟''

''ہاں بھئی مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ میں تو یہاں بڑے آرام سے ہوں۔ دراصل میں اللہ کی رضا میں راضی یہاں بھی ہوں اور وہاں بھی تھا۔ جو کچھ ملا خدا کا شکر بجالایا اور جو نہ ملا تو حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ مومن کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لئے خود کو مکمل طور پر اس کے سپرد کردے۔ اس کی خوشنودی اس کی رضا کے لئے ہمہ وقت تیار رہے۔ چاہے اس کے لئے اپنے نفس سے لڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ جو کچھ کرے حکم الٰہی کے دائرے میں رہ کر کرے۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ اس کا دائمی قیام گاہ نہیں ہے۔نووارد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''لیکن دولت حاصل کرنے کے لئے لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔ راتوں رات لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔''

''وہی جنہیں آخرت پر یقین نہیں ہوتا۔ وہ روشن مستقبل اور اقتدار کے حصول کے لئے بگٹٹ بھاگتے رہتے ہیں۔ بغیر یہ سوچے کہ اللہ کی پکڑ سے

بھاگ کر کہاں جائیں گے۔"

نووارد نے سر جھکالیا اور آہستہ سے کہا۔

"اب انسان بھی کیا کرے بے چارہ مجبور ہے۔ زندگی میں ہزار مسئلے ہیں۔ سب سے پہلے تو دال روٹی کا مسئلہ پھر بچوں کی پرورش پرداخت ان کی تعلیم تربیت کا مسئلہ۔ معیار زندگی بلند کرنے کا مسئلہ کہ آخر معاشرے میں اپنا کچھ مقام بھی بنانا ہے اور یہ غریب رشتہ دار تو جونک کی طرح چمٹ کر خون چوستے رہتے ہیں۔"

اس شخص کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ خون نہیں چوستے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کے مال میں غریبوں کا حصہ بھی رکھا ہے جسے ادا کرنا ان کا فرض ہے۔ کون جانے وہ کب ان سے ان کا یہ رتبہ چھین لے اور ان کی جگہ کسی اور کو کھڑا کر دے۔ وہ بڑا داتا ہے۔ وہ جب جسے چاہتا ہے اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔

کیا انہیں وہ ابدی جنت نہیں چاہئے جس کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے۔ جو ان کے سفر کی آخری منزل ہوگی جہاں ان کے عمل کی جزا ملے گی۔"

نووارد سوچ میں پڑ گیا۔ "اب تک مجھے کسی نے یہ سب بتایا ہی نہیں تھا۔ کاش مجھے دوبارہ دنیا میں جانے کا موقع ملتا تو میں ضرور اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔ کھٹ کھٹ۔ دستک کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی ۔ بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا سامنے چند پولس والے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟

''آپ کے نام وارنٹ ہے میں آپ کو ارسٹ کرنے آیا ہوں''

''میں نے کیا کیا ہے؟ وہ چکرا گیا۔ برزخ کی ایک جھلک نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس نے گڑگڑا کر اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔

کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی راہِ فرار نہیں مل رہی تھی۔

خواب خواب زندگی

ایک رات اس نے خود کو اس جگہ پایا، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، جہاں اس کا بچپن گزرا تھا، جہاں اس کی سہیلیاں تھیں، کلاس فیلوز تھیں۔

اس نے دیکھا کہ وہ اسکول یونیفارم میں کندھے پر کتابوں کا بستہ لیے ہوئے اپنی سہیلیوں کے ساتھ سے واپس آرہی ہے۔ اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے کہ اچانک اسے محسوس ہوا، کوئی پیچھے سے اس کا دامن کھینچ رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مینو اس کا دامن تھامے مسکرا رہی تھی۔

"کہاں بھاگی جا رہی ہے؟ جیسے کوئی انتظار کر رہا ہو۔"

تجھے معلوم نہیں کہ اگر مجھے گھر پہنچنے میں ذرا بھی دیر ہوجاتی ہے تو امی ورانڈے پر بے چینی سے ٹہلنا شروع کر دیتی ہیں۔ ساتھ ساتھ قرآنی آیتوں کا ورد بھی کرتی جاتی ہیں۔ اور مجھے جو ڈانٹ پڑتی ہے سو الگ۔"

اس نے اپنا دامن کھینچا، دوستوں کو بائی بائی کہا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ تبھی اسے ٹھوکر لگی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

نیند کیا ٹوٹی کہ سارے خواب ہی بکھر گئے، جس کے بکھرنے پر دل بھر آیا، آنکھیں بھر آئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے خواب کا یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا جائے اور وہ اپنے ماضی کے اس باغ میں ٹہلتی رہے، جسے وہ ہرا بھرا چھوڑ کر آئی تھی۔ ایک ایک پل سے گلے ملتی رہے۔ ایک ایک لمحے کو پھر سے انجوائے کرے۔ وہ گلیاں، وہ سڑکیں، وہ اسکول اور اس کا کمپاؤنڈ جہاں وہ

کھیلتی تھی۔ ہر وقت اسے یاد آتا۔ اسے اپنا ماضی بہت عزیز تھا۔ جسے اب تک وہ بھول نہیں پائی تھی۔ البتہ گزرے ہوئے وقت کی دھول نے اسے دھندلا ضرور کردیا تھا، لیکن ذہن سے کبھی محو نہ ہوسکا تھا۔ جب وہ اپنے ماں باپ کی شفقتوں کے سایہ میں دو روم کے فلیٹ میں رہتی تبھی تو یہ اسے اپنے محل جیسا لگتا تھا۔ اس کی کئی سہیلیاں ایسی بھی تھیں جو بنگلہ میں رہتی تھیں اور بعض ایسی بھی تھیں جو ایک روم کے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ لیکن ان میں اونچ نیچ، ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہ تھا۔ سب ایک ہی تھالی میں کھاتیں۔ عید میں گلے ملتیں۔ ہولی میں رنگ گلال کھیلتیں، دیوالی میں وہ بھی اپنے گھر میں دیا جلاتی۔ اس ڈر سے نہیں کہ لکشمی دیوی اندھیرا دیکھ کر لوٹ جائیں گی بلکہ یہ گنگا جمنی تہذیب کا سنگم تھا۔ اخوت اور بھائی چارے کی زندہ مثال تھی۔

جب بھی کوئی سائل اس کے دروازے پر آواز لگاتا تو چاہے وہ گھر کے کسی کونے میں ہوتی دوڑ کر جاتی اور یہ جانے بغیر کہ وہ کس ذات، کس مذہب کا ہے، جو اسے میسر آتا اسے دے دیتی۔ اور دعائیں لیتی۔ اب جب بھی کوئی سائل آتا اسے ہی ڈھونڈتا۔

یہ دعائیں اتنی موثر ثابت ہوئیں کہ ابھی وہ اپنے بچپن کو بھرپور انجوائے بھی نہ کرپائی تھی کہ اس کے رشتے کی بات ہونے لگی۔

’’ہما کیا یہ سچ ہے کہ تیری شادی ہونے والی ہے، ایسا سننے میں آرہا ہے۔‘‘ شمی نے اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

’’میں بھی تو ایسا ہی سن رہی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ میرے ساتھ اچھا ہورہا ہے یا برا۔‘‘

’’اتنی جلدی کیا تھی بنو! کچھ دن تو ہمارے ساتھ نبھاتی۔‘‘

"میں بھی کب تم لوگوں سے جدا ہونا چاہتی ہوں۔"

جب رشتہ طئے ہوگیا تو وہ کبھی اداس ہوجاتی اور کبھی ان کپڑوں اور زیوروں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی جو اس کے لیے بنوائے جارہے تھے۔ کچے ذہن میں کوئی بات ٹھہر ہی نہیں پارہی تھی۔

رخصت ہوتے وقت اسے اپنے ماں باپ بہن بھائی عزیز اقارب، سکھی سہیلیوں سے چھوٹنے کا غم ضرور تھا لیکن کچھ سہانے سپنے بھی تھے۔ اس نے سنا تھا کہ اس کی سسرال بہت ہی امیر ہے۔ وہاں کئی گاڑیاں، بنگلہ اور بہت سارے ملازم ہر وقت خدمت کے لئے موجود رہتے ہیں۔ جب وہ وہاں سے لوٹ کر آئی تو ماں باپ سکھی سہیلیوں سے مل کر بہت خوش ہوئی، بار بار گلے ملی۔ ایک ایک چیز کو یوں دیکھتی جیسے بہت دنوں بعد دیکھ رہی ہو۔ اور اب بھی اسے یہیں رہنا ہو، وہاں تو مہمان کے طور پر گئی تھی۔ لیکن ابھی اسے آئے پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ سسرال سے بلاوا آگیا۔ وہ اداس ہوگئی۔ لیکن بادل نخواستہ اسے جانا ہی پڑا۔

پہلی بار جب وہ وہاں گئی تھی تو چار دن کیسے گزر گئے اسے پتہ ہی نہ چلا تھا لیکن اب ایک پل بھی گزارنا مشکل ہورہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب وہ کھانے کے لئے چوڑے ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھتی جس پر طرح طرح کی ڈشیں سجی ہوتیں تو اسے وہ سمپل سا ٹیبل یاد آجاتا جس پر وہ اپنے پاپا، امی کے ساتھ بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔

جب فرج اور نعمت خانہ انواع واقسام کی چیزوں سے بھرا ہوتا تو اسے یاد آتا کہ پاپا کو جب تنخواہ ملتی تو وہ ڈھیر سارا میوہ لاتے جسے ڈبہ میں بند کر کے کسی اونچی جگہ رکھ دیا جاتا۔ اس کا جب جی چاہتا وہ اچک اچک کر ڈبہ اتارتی

اور مٹھی بھر بھر سب بھائی بہن مل کر کھاتے۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ اور وہ بیکل ہوکر ادھر ادھر ٹہلنے لگتی۔

شروع میں تو وہ ہر چار ماہ پر میکے آجاتی تھی لیکن پھر وقفہ بڑھتا گیا۔ وقت کا پنچھی اڑتا رہا۔ یہاں تک کہ سالوں بیت گئے۔ پاپا ریٹائر ہوکر اپنے آبائی شہر میں سٹل ہوگئے لیکن اس کے دل میں اب بھی یہ تمنا موجزن تھی کہ ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کرے۔ یہ خواب دیکھ کر وہ اور جذباتی ہورہی تھی۔ جو خلش اس کے ناپختہ ذہن میں سما چکی تھی وہ اب تک دور نہیں ہوئی تھی۔

''پاپا! میں ایک آخری بار اس جگہ کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں سے میرے بچپن کی بہت ساری یادیں وابستہ ہیں، اس نے پاپا سے التجا کی۔ ''بٹیا! اب وہاں کیا رکھا ہے نہ کوئی اپنا نہ پرایہ، نہ دوست نہ احباب۔ سب بکھر گئے۔''

''پاپا! میں سڑکو سڑکوں گھوموں گی، اپنا کوارٹر دیکھوں گی، در و دیوار سے گلے ملوں گی۔''

''ہما! ابھی تک تمہارا بچپنا نہیں گیا ہے بٹیا! پاپا نے مسکرا کر کہا۔ پھر بیٹی کی دلجوئی کی خاطر اس کی بات مان لی۔

جب وہ روانہ ہوئی تو یادوں کا قافلہ بھی ساتھ ساتھ رواں دواں تھا۔ جیسے ہی گاڑی کالونی کے اندر داخل ہوئی، اس کا دل زور زور سے دھڑکا بچپن کی کھٹی میٹھی، شریر اور معصوم یادیں اس کے ارد گرد چکر لگا رہی تھیں۔ وہ بڑے اشتیاق سے گردن گھما گھما کر کبھی دہنی طرف دیکھتی اور کبھی بائیں طرف۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا۔ جاڑے کی شام کی ملگجی روشنی میں کالونی بہت ہی ویران لگ رہی تھی۔ کوارٹر کے اندر خود رو جھاڑیاں اور لمبے لمبے درخت بے ترتیبی

سے پھیلے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ درختوں کے خشک پتے اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ ڈرائیور کو راستہ بتاتی ہوئی سب سے پہلے اپنے کوارٹر کے پاس پہنچی۔ وہ اپنا فلیٹ دیکھنے کے لئے بہت ہی اکسائٹڈ تھی۔ گیٹ کے اندرر داخل ہوتے ہی اس کا سارا جوش خروش ماند پڑ گیا۔

کمپاؤنڈ اجاڑ بنا ہوا تھا۔ کوارٹر میں نہ جانے کب سے رنگ و روغن نہیں ہوا تھا۔۔ بوسیدہ دیواریں، کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا فرش اور جگہ جگہ لٹکے ہوئے بجلی کے تار اپنی خستہ حالی کی داستان سنا رہے تھے۔ وہاں کی ابتر حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ کہاں گئے وہ لوگ جو کالونی کو دلہن کی طرح سجا کر رکھتے تھے؟ اب کسی کی نظریں یہاں کی خستہ حالی پر کیوں نہیں پڑتیں۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے خیالوں کی تردید کی۔ نظر بھی کیسے پڑے۔

جب کسی منہ کو حرص اور بے ایمانی کا ذائقہ مل جاتا ہے تو کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ لالچ کی پٹی آنکھوں پر بندھی ہوتی ہے۔ ان کے پیش نظر صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔ گاڑی، بنگلہ، بینک بیلنس اور بچوں کی ہائی ایجوکیشن ، زمانے کی رفتار کتنی تیز ہوگئی ہے۔ حالات کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اس پندرہ سولہ سالوں کے اندر کتنے تغیرات رونما ہو چکے ہیں۔ وہ ان ہی خیالوں میں غرق تھی کہ کسی آواز پر نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ایک شخص کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ ''آپ لوگوں کو کس سے ملنا ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کسی سے نہیں بھائی۔ میں اس فلیٹ میں بیس سال رہ چکا ہوں وہی ذرا دیکھنے آ گیا ہوں۔ میری بچی کو یہاں آنے کا بڑا شوق تھا۔

''تو آئے اندر آجایئے۔''

لیکن اس نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا دل بہت بڑا ہو گیا

تھا۔

''اب کہاں چلوں؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''چلو کچھ دیر یونہی گھومتے ہیں۔''

گاڑی جب آفیسر ہاسٹل کے پاس سے گزری تو اچانک اسے نوری بوا یاد آگئیں جو تقریباً دس بارہ سال اس کے یہاں ملازمہ رہ چکی تھیں اور اب آفیسر ہوسٹل کے سرونٹ کوارٹر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس نے گاڑی رکوائی اور ایک شخص کی رہبری میں جھاڑ جنگل اور ناہموار راستوں سے گزرتی ہوئی سرونٹ کوارٹر تک پہنچی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر خمیدہ کمر والی ایک ضعیف عورت نے دروازہ کھولا اور پیشانی پر ہتھیلی کا چھجہ بنا کر چندھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے۔ پوچھا۔ ''کون۔ کون ہے؟''

''میں ہوں بوا ہما مجھے پہچانا نہیں؟''

''ارے ہما بٹیا تم؟'' انہوں نے دونوں بازو پھیلا کر ہما کو لپٹا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی جب آنسو ذرا تھمے تو پوچھا۔

''کیسے آنا ہوا بٹیا؟''

''آپ سے ملنے آئی ہوں بوا۔''

''اللہ میرا دل کتنا بڑا کر دیا۔ جگ جگ جیو، خوش رہو آباد رہو۔''

''کیسی ہیں بوا؟''

''دیکھو بابو اب تو صحت اور گر گئی ہے جب سوانگ تھا تم لوگوں سے ملنے جاتے رہتے تھے۔ اب تو چلنا پھرنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''اور بوا بتایئے یہاں کا حال چال؟''

''کا بتاویں بٹیا۔ اب تو نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ پیار محبت رہا۔

''تم لوگوں کو اتنے دنوں بعد دیکھ کے کا بتاویں کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ بیٹھو کھانا بناوے ہیں کھا کے جئیو۔''

''نہیں بوا آپ تو خود کمزور ہیں۔ کیوں تکلیف کیجئے گا۔ مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے ورنہ پہنچنے میں بہت رات ہو جائے گی۔ اس نے بوا کے ہاتھ میں کچھ روپے پکڑائے اور جانے کی اجازت مانگی۔ بوا نے ایک بار پھر اسے گلے سے لگایا اور نم آنکھوں سے رخصت کیا۔

''اب کدھر چلوں؟'' ڈرائیور نے پھر پوچھا۔

اچانک اسے نیلم آنٹی یاد آگئیں۔ وہ فورم میں رہتی تھیں۔ اس نے گاڑی اسی طرف موڑنے کو کہا۔ وہ جگہ ویسے بھی سنسان رہتی تھی اور اس وقت تو آدھے سے زیادہ کوارٹر بند ہی پڑے تھے۔ دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کدھر سے ایک شخص نمودار ہوا کہ پورا علاقہ تو جھاڑ جنگل سے بھرا تھا۔ ''کسے کھوج رہے ہیں؟''

نام اور پتہ بتانے پر اس نے کہا۔ ''وہ لوگ اب یہاں نہیں رہتے۔ انہیں یہاں سے گئے کافی دن ہو گئے۔''

''ہما! اب چلو بٹیا اب تمہارا ارمان پورا ہو گیا نا؟ پاپا نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

لیکن ہما کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ وہاں تھی ہی کب وہ تو ماضی کے خوشگوار ماحول میں گم حال سے اس کا موازنہ کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی حرام خوری اور چور بازاری کے عفریت نے چہچہاتی ہوئی جنت نشان جیسی جگہ کو کھنڈر میں بدل دیا ہے۔ وہ اپنے دل پر بھاری بوجھ لے کر واپس ہوئی۔

زود پشیماں

آج پھر کچھ لوگ اسے دیکھنے آنے والے تھے۔ آج پھر اسے اپنی انا کو کچل کر چہرے پر مصنوعی بشاشت اور ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ سے آنے والوں کا استقبال کرنا تھا۔ ان کے الٹے سیدھے سوالوں کا شائستگی سے جواب دینا تھا۔ اپنی کم مائیگی کو ان کی نظروں سے چھپانا تھا۔ برسوں سے یہ ڈرامہ کھیلا جارہا تھا اور وہ اس کا ایک اہم کردار تھی۔ لوگ آتے قورمہ پلاؤ اڑا کر ڈکار لیتے ہوئے چلے جاتے۔ کبھی لڑکی کا سانولا رنگ قابل اعتراض ہوتا، کبھی اس کا لاغر پن تشویش کا باعث ہوتا اور کبھی حسب نسب کا سوال کھڑا ہوجاتا کہ لڑکی کس خاندان کی ہے؟ اس کے ماں باپ بھائی بہن رشتے ناطے والے کون ہیں، کہاں ہیں، سینکڑوں سوالات اٹھتے۔ اس کھیل سے وہ تنگ آگئی تھی جی میں آتا کہہ دے ”میں کوئی لنگڑی لولی نہیں ہوں۔ نہیں ہے مجھے کسی سہارے کی ضرورت۔ خدا نے مجھے دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دل و دماغ اور عقل سمجھ عطا کی ہے۔ پھر میں کیوں تماشا بنوں۔ کیوں رحم طلب نگاہوں سے کسی کی طرف دیکھوں۔ کیوں فقیروں کی طرح جھولی پھیلاؤں؟ عورتوں کی ان ہی کمزوریوں نے مردوں کے حوصلے بلند کردئے ہیں۔ چاہے وہ خود کسی قابل ہوں یا نہ ہوں، خواہ ساری زندگی بیوی کی کمائی پر عیش کرتے رہے ہوں۔ لیکن احساس برتری کے نشہ میں چور رہتے ہیں۔ ابا نے چاہے کچھ دیا ہو یا نہیں، اپنا نام، اپنی فرزندی میں قبول نہ کیا ہو لیکن ان کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے

اس قابل بنا دیا ہے کہ میں خود اپنا سہارا بن سکتی ہوں۔ لیکن یہ سماج کے ٹھیکے دار چین سے جینے نہیں دیتے اور اوپر والا حرام موت مرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر میں کیا کروں؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ساری ساری رات اس سوچ میں گزر جاتی کہ لوگ کیوں لاوارث بچوں کو اٹھا لاتے ہیں؟ اگر اٹھاتے ہی ہیں تو اپنا نام دینے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے؟

وہ ریں ریں کرتی بچی ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتی جو اپنے خارش زدہ پاؤں کو زمین پر رگڑتی رہتی۔ آنکھوں اور ناک سے بے تحاشہ پانی گرتا رہتا۔ سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نوچتی کھسوٹتی رہتی جو خارش کے علاوہ جوؤں سے بھرا رہتا۔ ابا جب کام پر سے لوٹتے تو اسے پیار کرتے، منہ ہاتھ صاف کرتے، کپڑے بدلتے۔ پھر انگلی تھام کر بازار لے جاتے۔ ٹافی اور کھلونے دلواتے۔ اس طرح ریں ریں کرتی ہوئی وہ بچی پرائمری اسکول تک پہنچ گئی۔ وہاں جب بچوں کی مائیں کبھی بچوں کو لے جانے یا ان کا رپورٹ کارڈ لینے کے لئے آتیں تو اسے بہت اچھا لگتا۔ اس کے دل میں بھی یہ تمنا جاگتی کہ کاش اس کی بھی کوئی ماں ہوتی۔ کبھی وہ پوچھتی۔

"ابا! میری ماں کہاں ہے؟" ابا اسے پیار کر کے کہتے۔

"جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو خود ہی تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

پھر نہ جانے کیوں ابا نے نوکری چھوڑ دی اور اسے ساتھ لے کر گاؤں آ گئے۔ وہاں اسے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ گئی جیسے کوئی عجوبہ ہو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ اتنے حیرت زدہ کیوں ہیں؟ وہاں امی تھیں، بہن بھائی تھے، پھوپھی خالہ تھیں۔ لیکن کسی نے اسے لپٹا کر پیار

نہیں کیا۔ بڑا سا کنبہ تھا سب کے گھر آس پاس تھے۔ ہر گھر میں یہ بات گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔

''بھابھی! سنا تم نے؟ نعیم بھائی ایک لڑکی لے کر آئے ہیں۔''

''ارے ہوگی انہیں کی بیٹی وہاں کسی سے شادی وادی کر لی ہوگی۔ آخر اتنے دن وہاں کیسے گزارا؟''

''وہ کہتے ہیں کسی مسجد سے اٹھا کر لائے ہیں۔''

''چلو اچھا ہے کبھی کام ہی آجائے گی'' اور سچ مچ وہ ایسی کام آئی کہ سبھوں کی آنکھوں کی پتلی بن گئی۔ سب رشتہ دار اسے پیار کرنے لگے تھے۔ ہر ایک کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ ان کے پاس رہے۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اتنی معصوم، مہذب اور خدمت گزار لیکن کوئی بھی اسے اپنا رشتہ دار کہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ بات جب اس کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگی تو اس نے پوچھا۔

''ابا سچ سچ بتایئے میں کون ہوں؟ آپ سے میرا کیا رشتہ کیا تعلق ہے۔''

ابا اس غیر متوقع سوال پر گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''تم میری بیٹی ہی جیسی ہو۔''

''بیٹی جیسی ہوں، کیا میں آپ کی بیٹی نہیں؟''

''نہیں جب تم بہت چھوٹی تھی، میں نے تمہیں ایک مسجد سے لا کر پالا۔ اس کی اٹھی ہوئی پلکیں جھک گئیں۔ دل سے یہ آواز آئی۔ ابا! کاش آپ کہہ دیتے کہ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔''

شک تو اسے پہلے ہی سے تھا لیکن اب تو ابا نے سب کچھ واضح طور بتا دیا تھا۔ لہٰذا اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ اس انکشاف نے اسے اس قدر ہرٹ کیا کہ وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ابا سے اسے

ایک خاص لگاؤ تھا۔ اپنے یا پرائے آخر سب کچھ وہی تو تھے۔ ابا کوئی ذی حیثیت آدمی نہ تھے۔ باپ دادا نے کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ بیٹے نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ بیٹی بیاہ کر اپنے گھربار کی ہوگئی۔ امی جو دائمی مریض تھیں ایک لمبی علالت کے بعد رحلت فرما گئیں۔ ابا بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ان نامساعد حالات میں، ابا کی عنایتوں کا قرض اس نے یوں اتارا کہ انہیں ساتھ لے کر شہر آ گئی۔ وہاں ایک بوتک میں کام پر لگ گئی چند چھوٹے بچوں کو ابتدائی درس بھی دینے لگی۔ اس طرح ابا کا سہارا بن گئی۔ ابا اب بہت چپ چپ اور پریشان سے رہنے لگے تھے۔ شاید اس لیے کہ اب اس کا رشتہ آنا تقریباً بند ہو چکا تھا۔ یہی ان کی پریشانی کا باعث تھا۔ لیکن اس نے تو اپنے ذہن سے یہ بات بالکل نکال دی تھی کہ کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں ازدواجی سکھ لکھا بھی ہے یا نہیں۔

وقت اپنی ڈگر پر چل رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کئی ماہ و سال گزر گئے۔ وہ لاغر سانولی لڑکی اب بہت بدل چکی تھی۔ چہرہ گول اور رنگ سنہرا ہو گیا تھا۔ گردش وقت نے اسے اور بھی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ بہت ہی سادگی سے رہتی۔ ہر وقت دوپٹہ سے اپنا سر ڈھکے رہتی۔ ایک دن اتفاق سے آنچل سر سے سرک گیا تو اچانک ابا کی نظر اس کے بالوں میں جھلملاتے ہوئے بے شمار چاندی کے تاروں پر پڑ گئی۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ اندر پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ احساس جرم سے نظریں جھک گئیں۔ کیا منہ دکھاؤں گا خدا کو؟ کیا جواب دوں گا، جب وہ پوچھے گا تیرے سچ بولنے میں کون سی بات مانع تھی؟ کیا بندوں کا خوف خدا کے خوف پر غالب تھا؟

انتظارِ لاحاصل

ماں کی جنگھاڑتی ہوئی آواز نے آج پھر اس کے خوابوں کا مزہ کرکرا کردیا تھا۔ وہ جبراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''میں روز ایک ہی خواب کیوں دیکھتی ہوں کہ گھوڑے پر سوار کوئی شہزادہ آیا اور اسے کھٹولے پر بیٹھا کر لے گیا۔ پر اس کی ایسی قسمت کہاں؟ اس نے توجب سے ہوش سنبھالا ہے، در در کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔''

ماں کی کرخت آواز پھر سماعتوں سے ٹکرائی۔

''یونہی بیٹھی ہوئی ٹکر ٹکر دیکھتی رہے گی یا کچھ کرے گی بھی۔ جھاڑو بہارو کیا تیرا باپ کرے گا؟'' ماں سامنے کھڑی اسے قہر برساتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور جھٹ جھاڑو سنبھال لیا۔ ماں کی بڑبڑاہٹ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں لبریز ہوگئیں۔ ''یہ اس کی ماں ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا ماں ایسی ہوتی ہے؟'' اسے اپنی پڑوسن زیتون پر رشک آرہا تھا، جس کی ماں کتنے پیار سے اسے اٹھاتی تھی۔ کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا بھی کھلاتی تھی، اس کی چوٹی پاٹی بھی کرتی تھی۔

ماں تو ماں اس کا بابا بھی کون سا بہت ستھرا تھا۔ کچی پکی بڑی بڑی مونچھیں اور آنکھیں ایسی ڈراونی جیسے ہر وقت نشہ میں رہتا ہو، اسے دیکھ کر خوف سے دل لرز جاتا۔ اس نے کبھی اس سے پیار بھری باتیں کیں نہ کبھی شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔ نہ جانے کیسی قسمت لے کر وہ پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ان لوگوں

نے اس پر اتنا کرم کیا تھا کہ اسکول میں اس کا داخلہ کروادیا تھا۔ اس طرح دس بجے صبح سے شام چار بجے تک اس کا وقت سکون سے گزر جاتا۔ اس نے چند سہیلیاں بھی بنالی تھیں جن سے گپ شب کر کے وہ اپنا غم غلط کرلیتی۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گھر کے حالات بھی بدستور ویسے ہی تھے۔ البتہ ایک تبدیلی ضرور آئی کہ کبھی کبھی چند لوگ آتے اور بابا سے کھسر پھسر کرتے رہتے۔ کبھی ماں بھی اس میں شامل ہو جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس موضوع پر وہ اتنی سیریسلی گفتگو کرتے ہیں۔

اور ایک دن وہ ہو گیا جو اکثر خواب میں دیکھا کرتی تھی۔ خواب کی تعبیر مل تو گئی تھی لیکن ادھوری۔ شہزادہ آیا ضرور تھا لیکن نہ تو وہ گھوڑے پر سوار تھا نہ ہی اس کے پاس کوئی کھٹولا تھا۔

اسے سجا سنوار کر بیٹھا دیا گیا۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ اب مولوی صاحب آئینگے اور اس کا عقد ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسے اس شخص کے ساتھ رخصت کردیا گیا۔ وہ اسے ایک تانگہ پر بیٹھا کر لے گیا۔ وہ جس گھر میں لائی گئی تھی وہ کوئی محل نہ تھا۔ بس ایک چھوٹا سا مکان تھا، بالکل سنسان اور دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا۔

''یہ وہ کہاں آگئی؟ اسے عجیب سی بے چینی محسوس ہورہی تھی۔ آخر اسے کس مقصد کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہونے لگی۔

''کیا بابا نے اسے بیچ دیا؟''

اور جب اسے اصلیت کا پتہ چلا تو اسے ایسا لگا جیسے اسے خندق میں ڈال دیا گیا ہو اور وہ غلاظت میں ڈوب گئی ہو۔ پھر تو اس کی زندگی میں ہر

رات ایک نیا شہزادہ آتا رہا اور اس کا وجود پاش پاش ہوتا رہا۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس مکروہ اور ناپاک جسم کو ختم کردے۔ لیکن کہیں اس کے اندر سے آواز آتی، دنیا تو خراب ہو ہی گئی اب آخرت کیوں خراب کرنا چاہتی ہے۔ وہ بیچین ہوجاتی، اس کے اندر سے یہ کراہ اٹھتی۔

''کہاں ہیں اس کے حقیقی والدین؟ اس کے دل کی یہ درد بھری آواز ان تک کیوں نہیں پہنچتی؟'' وہ کیا جانے کہ یہ اس کے دل کی پکار ہی تو ہے جس نے اس کے حقیقی باپ 'کرمو' کو بیچین کر رکھا ہے اور وہ اس دن کو یاد کرتا رہتا ہے جب پہلی بار بیوی سے اس کی زبردست لڑائی ہوئی تھی، یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت آگئی تھی اور اب تو ہر دو چار روز بعد جھگڑا کھڑا ہوجاتا اور ان دونوں کی لڑائی کی زد میں وہ معصوم اور بدنصیب بچی آجاتی، جو دنیا میں آتے ہی ماں کی آغوش سے محروم ہوچکی تھی۔ کرمو بیحد پریشانی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، کام پر جائے یا بچی کو سنبھالے۔ کوئی قریبی رشتہ دار ایسا نہ تھا جو بچی کی دیکھ بھال کرتا۔ لاچار اسے دوسری شادی کرنی پڑی۔ کچھ دن تو ٹھیک ٹھاک رہا پھر جھگڑا شروع ہوگیا۔ بچی سارا دن گندگی پر پڑی رہتی، بھوک سے بلبلاتی رہتی۔ جب وہ کام پر سے لوٹتا تو اس کا خون کھول جاتا اور پھر جھگڑا شروع ہوجاتا۔

اس کے کئی ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ کسی ضرورت مند کے ہاتھوں بچی کو فروخت کردے، اس طرح تمہاری مشکل آسان ہوجائے گی اور اس کی زندگی بھی سنور جائے گی۔

کرمو کئی روز تک اس موضوع پر غور کرتا رہا پھر حالات سے مجبور ہوکر اس نے اپنے دوست کی بات ماننے کا فیصلہ کرلیا۔

بچی کو کسی غیر کے ہاتھوں سونپتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل میں عجیب سی بے چینی تھی لیکن ذہن پر سکون تھا، چلو روز روز کے جھگڑے سے تو جان چھوٹی۔ پر اس کی زندگی میں سکون نہ تھا۔ اسے ازدواجی زندگی جینا نصیب نہ تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد بیوی لڑجھگڑ کر اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہوگئی۔ اور وہ زمانے کی ٹھوکریں کھاتا رہا، لوٹ پوٹ کر جیتا رہا۔

لیکن بیٹی اس کے دل و دماغ سے محو نہ ہوسکی تھی۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ جس شخص کے ہاتھوں فروخت کیا تھا اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا لیکن وہ ملا نہ بیٹی ملی۔ وہ تو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتی رہی۔ اسی طرح سالوں بیت گئے لیکن اب بھی وہ اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ ہر اس جگہ اسے تلاش کرتا جہاں اس کے ملنے کا امکان ہوتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا اگر وہ مل بھی گئی تو کیا وہ اسے پہچان پائے گا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ اس کے اوپر والے ہونٹ کے بائیں طرف ایک بڑا سا کالا تل ہے جو اسے پہچاننے میں مددگار ہوگا۔

گویا اب بھی اس کے دل میں بیٹی کے ملنے کی موہوم سی امید باقی تھی اور اس کی تلاش جاری تھی۔

ایک دن ڈھونڈتا ہوا وہ اس اڈے پر پہنچ گیا جہاں نئی نئی لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی ایک لڑکی کھڑی تھی جسے دیکھتے ہوئے اس کی غمناک آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔

''ہاں یہ وہی تو ہے۔ اس کے بائیں ہونٹ پر ایک کالا تل اس کے یقین کو پختہ کررہا تھا۔ لڑکی بھی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں ہوس نہ تھی نہ ہی محبت تھی بلکہ محبت سے بھی اونچی کوئی شئے تھی جس نے

اسے عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ کچھ دیر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ وہ خاموش نظروں سے دیکھتا رہا لیکن لڑکی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

''کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟ کیا تمہارے یہ آنسو بے مول ہیں؟''

اس نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ آنسو نہیں، میرے خون کے قطرے ہیں جو میری بربادیوں کے تابوت پر اشک بن کر گر رہے ہیں۔'' لڑکی نے سسکتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر وہ کسی خیال میں ڈوبا رہا پھر گویا ہوا۔

''کیا تم یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئیں؟''

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا کوئی انسان اپنی مرضی سے جہنم میں آسکتا ہے؟''

''اگر کوئی تمہیں اس جہنم سے نکالنا چاہے تو؟''

''تو میں زندگی بھر اس کی داسی بن کر رہوں گی۔''

وہ کچھ دیر وہاں بے مقصد بیٹھا رہا، پھر اپنی راہ لی۔ اس رات اسے نیند بالکل نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے دل میں جو زخم مدت سے پنپ رہا تھا اس میں شدید قسم کی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ کاش وہ اپنی بیٹی کو اس جگہ نہ دیکھتا، چاہے ساری زندگی اس کی تلاش میں ہی گزر جاتی، ایک بھرم تو رہ جاتا۔ اس نے تہیہ کیا کہ کسی طرح وہ اسے اس جہنم سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن کیا وہ لوگ اتنی آسانی سے اسے چھوڑ دینگے۔ یہ دنیا بڑی مکروہ جگہ ہے۔ اگر یہ سماج کے ٹھیکیدار بدنیت اور ہوس پرست نہ ہوتے تو اتنے

مسائل ہی نہ کھڑے ہوتے۔ اس لالچی دنیا میں تو پنڈت ملا بھی پیسے کے آگے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ نہ جانے وہ لوگ کتنے پیسوں کا ڈیمانڈ کرینگے۔ لاکھ، دو لاکھ۔ لیکن اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ کاش وہ اپنی بیٹی کو ان ظالموں کے پنجوں سے چھڑا کر اتنی دور لے جاتا کہ وہ اس کی پرچھائیں کو بھی نہ پاسکتے۔ لیکن یہ ممکن ہے کیا؟ وہ مایوس ہوگیا، تبھی اس کے ذہن میں ایک شعلہ سا لپکا۔

ہاں اب بھی اس کے پاس دو قیمتی چیزیں ہیں۔ ایک اس کی آنکھیں اور دوسرا اس کا گردہ۔ وہ اپنی آنکھیں تو نہیں بیچ سکتا کیونکہ مدت سے یہ آنکھیں اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے ترس رہی ہیں۔ البتہ ایک گردے پر کچھ دن زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کا دونوں گردہ خراب ہو چکا ہے۔ اب وہ زیادہ دن نہیں جی سکے گا۔

یہ سنتے ہی وہ چکرا کر ایسا گرا کہ پھر کبھی ہوش نہ آیا۔

جب سے وہ شخص اسے تسلی دے کر گیا تھا تب سے اس لڑکی کی آنکھیں دروازے پر ٹکی رہتیں۔ سالوں گزر گئے لیکن وہ مہربان کبھی لوٹ کر نہ آیا۔

KHALEEJ

(Short Stories)

BY

NAUSHABA KHATOON

Naushaba Khatoon

ISBN 978-93-89002-09-6

978-93-89002-09-6

www.ephbooks.com

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

New Delhi , INDIA

نوشابہ خاتون زمانۂ حال کی خواتین افسانہ نگاروں میں نمایاں اور مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ معروف وذی وقار بھی ہیں۔ موقر رسائل وجرائد میں ان کے افسانے متواتر شائع ہوتے رہے ہیں۔ دو مجموعے ''نقار خانہ'' اور ''بالا دست'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک معاشرتی ناول نیا شوفر بھی منظر عام آ چکا ہے۔ تیسرا مجموعۂ افسانہ ''خلیج'' عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے۔ ان کا ایک سوانحی ناول ''خزاں کے بعد'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی جولانی طبع اور قلم کی رفتار سست اور دھار کند نہیں ہوئی ہے۔ میرے خیال میں انہوں نے خود کو ادبی تحریک یا رجحان سے بھی آزاد رکھا ہے۔ تخلیقی وجدان کی رہنمائی اور معاشرے میں پھیلے واقعات و واردات کے مشاہدات و تجربات کے تانے بانے سے کہانیاں بنتی رہی ہیں۔ ان کہانیوں سے حیات وکائنات اور معاشرتی مسائل و معاملات کے سلسلے میں ان کا زاویۂ نظر واضح ہوتا رہا ہے جو غیر منظم اور غیر مرتب صورت میں یا بکھرا بکھرا سا دکھائی دیتا ہے لیکن ان بکھرے عناصر کو ترتیب دے دیا جائے تو وہ ایک فلسفۂ حیات بن سکتا ہے اور اس لحاظ سے سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ اس پہلو پر تفصیل سے لکھنے کے لئے جتنے صفحات و اوقات کی ضرورت ہے، وہ سرِ دست میسر نہیں، اس لیے یہاں اس پہلو سے گریز لازم ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی ادیب یا فنکار کے لئے خرد کے نظریات سے زیادہ اہم اس کے اپنے مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں۔ مشاہدات کا تعلق دیکھے ہوئے اور تجربات کا تعلق بھوگے ہوئے یا جھیلے ہوئے واقعات و واردات سے ہے۔ پچیس افسانوں پر مشتمل ''خلیج'' میں دونوں طرح کے واقعات و واردات اور مسائل و معاملات عکس ریز ہوئے ہیں جن کا بیان خوش سلیقہ اسلوب اور عظیم آباد، پٹنہ کے مضافات بالخصوص ضلع نالندہ کے شرفاء گھرانے کی خواتین خانہ کی زبان میں ہوا ہے۔ یہ وضاحت شاید یہاں غیر ضروری نہ ہو کہ ادب کا سارا کھیل زبان وبیان ہی پر منحصر ہوتا ہے اور کوئی بھی ادبی متن یا ادب پارہ سب سے پہلے زبان وبیان ہی کی وجہ سے متاثر کرتا ہے اور مطالعے کے ذوق کو شوق کی راہ پر ڈالتا ہے۔ کم از کم میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ''خلیج'' کے مطالعے میں سب سے پہلے میری توجہ نوشابہ خاتون کے اسلوبِ بیان اور اندازِ زبان ہی کی طرف مبذول ہوتی ہے۔

پروفیسر منظر اعجاز